جلد ۷۶ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان وپاکستان کی علمی دنیا کا یہ بڑا افسوسناک سانحہ ہے کہ گذشتہ مہینہ مشہور صاحب علم وقلم قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اسلامی علوم کے ممتاز فاضل تھے خصوصاً اسلامی تاریخ پر انکی نظر نہایت وسیع تھی اور ان کا علمی وتحقیقی مذاق بہت بلند تھا، عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں دستگاہ حاصل تھی، اور تینوں میں مضامین لکھتے تھے، ان کے مضامین ہندوستان وپاکستان کے تمام سنجیدہ علمی رسالوں میں نکلتے تھے، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، ان کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے، اقبال پر ان کی ایک کتاب حال ہی میں چھپی ہے، دار المصنفین سے بھی ان کی ایک کتاب ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے، اگر ان کے مضامین جمع کیے جائیں توکئی جلدوں میں آئیں گے۔

مرحوم ریاست جوناگڈھ کے جاگیردار تھے۔ وہاں کے انقلاب میں لٹ لٹا کر بڑی مصیبتوں سے کراچی پہنچے، کچھ دنوں تک انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے، اس کے بعد سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہو گئے تھے، طبعاً نہایت شریف متواضع اور خاکسار تھے، دار المصنفین سے انکا تعلق بڑا پرانا اور مخلصانہ تھا، ابھی انھوں نے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کیلیے لائسنس دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اب اس زمانہ میں ایسے صاحب کمال کی جگہ کا بھرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، انتقال کیوقت ۷۰ سال سے اوپر کی عمر رہی ہو گی،

دوسرا حادثہ مولانا عبد الحی صاحب مدنی کی وفات کا ہے، وہ ہندوستان کے ممتاز علما میں تھے، انکی پیدائش، تعلیم وتربیت اور نشو ونما مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی، اس لیے مدنی کہلاتے تھے دینی علوم میں مہارت کے علاوہ عربی زبان وادب میں اہل زبان کی جیسی بصیرت حاصل تھی، مراد آباد کی شاہی مسجد کے مشہور مدرسہ میں درس واہتمام کی خدمت انجام دیتے تھے، اور اب یہ مدرسہ ان ہی کی بدولت چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ دینی علوم کے اس خادم کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے، اب زمانہ کے اثر سے ہماری دینی درسگاہوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے، اور نئے علما میں وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو پرانے علما کا طغرائے امتیاز تھی، اس لیے ان میں جو یادگار مٹ جاتی ہے اس کا بدل نہیں پیدا ہوتا،

بالآخر گاؤکشی کا بل اس صوبہ میں پاس ہوگیا، اس کارنامہ کی توقع اسی حکومت سے ہوسکتی تھی جس کے ہاتھ اردو کے خون اور مسلمانوں کی حق تلفی سے رنگین ہیں، چنانچہ گاؤکشی کے قانونی انسداد کا سہرا بھی اس کے سر رہا اور ابھی

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے یوں بھی گاؤکشی قریب قریب بند ہو چکی تھی، اس لیے اس قانون کی ضرورت ہی نہ تھی، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دنیا کی نگاہوں میں نام نہاد سکلرزم کا پردہ پوری طرح فاش ہوگیا، محض الفاظ کے طلسم سے حقیقت نہیں چھپ سکتی، ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس کے بعد ان سب جانوروں کو بھی جنھیں۔ - - - - . . . . . ہندو مذہب میں تقدس کا درجہ حاصل ہے، مارنا ممنوع قرار دیا جائے تاکہ پھر کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ باقی نہ رہے،

ہالینڈ استشراق کا پرانا مرکز ہے، وہاں کے فضلا نے اسلامیات پر بڑا کام کیا ہے، اور اسلامی علوم وفنون کی بیشتر اہم قدیم اور نادر کتابیں ان ہی نے تلاش کرکے بڑے اہتمام سے تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کی ہیں، وہاں اسلامی انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب کی گئی تھی، اب اس کے نئے اڈیشن کی اشاعت کے لیے اس پر نظر ثانی کی جارہی ہے، ہم کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ نظر ثانی کرنیوالوں میں ایک بھی مسلمان نہیں، سب کے سب عیسائی، یہودی اور بعض اسرائیلی یہودی ہیں، جن کی اسلام دشمنی

معلوم و مسلّم ہے، اس سے انکار نہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں میں اسلامیات کے بہت سے ماہر موجود ہیں، لیکن وہ اسلامی تاریخ اور مذہب اسلام کے بعض پہلوؤں پر صحیح نقطۂ نظر سے سوچ ہی نہیں سکتے، اسی لیے ان کی تحقیق اور ان کو پیش کرنے میں اکثر فاش غلطیاں کرتے ہیں جس کی مثالیں پہلے اڈیشن میں موجود ہیں، اس لیے ان کی تصحیح کے لیے کسی مسلمان فاضل کا رکھنا ضروری ہے، دوسرے اسلامی اداروں کو بھی حسب ذیل پتہ پر اس کی جانب توجہ دلانا چاہیے،

Dr. N. W. Posthumus

E. J. Brill's Boekhandel

Leyden, Holland

سیرت سلیمانی کے متعلق استفسار کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں، اس کی تالیف میں عرصہ لگتا، اس لیے جن لوگوں کو اس کا زیادہ اشتیاق تھا، ان کی تشفی کے لیے معارف سلیمان نمبر نکالنا ضروری تھا، اب انشاء اللہ جلد ہی سیرت سلیمانی شروع کرنے کا ارادہ ہے، اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے احباب اور متوسلین خاص سے بھی مشورہ کیا جائیگا، اور اگر ضرورت ہوئی تو قلمی مدد بھی لیجائیگی،

شمس الائمہ سرخسی کی اصول سرخسی، اصول فقہ کی اہم اور نادر کتابوں میں ہے، مولانا ابو الوفاء صاحب ناظم لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے کئی نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح و مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اور ادارۂ مذکور نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر دو جلدوں میں شائع کی ہے، جن شائقین کو اس کی تلاش ہو وہ مذکورہ بالا پتہ سے طلب کریں،

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں سواروں کا نظام

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم، اے

(۲)

تیمور کے سوار

جب یہ سوار میدان جنگ میں آتے تو لڑائی کے وقت اسی تہور، طیش اور غضب کا مظاہرہ کرتے جس کے لیے تاتاری اور تیموری سوار مشہور تھے، تیمور کی ساری کشورکشائی اس کے بہادر سواروں ہی کی بدولت تھی، اس کے لشکر میں سواروں کی تنظیم بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر تھی، اس کے ہر امیر کو سو سو گھوڑے رکھنے کا حق تھا، اون باشی دس سپاہیوں کا سردار، یوز باشی سو سپاہیوں کا افسر اور مینگ باشی ایک ہزار سپاہیوں اور امیر الامراء دس ہزار سپاہیوں کے سردار ہوتے تھے بعض سوار بازو پر آہنی سپر اور ہاتھ میں پانچ فٹ کا لمبا نیزہ رکھا کرتے تھے، وہ جب غنیم کی تعداد زیادہ دیکھتے تو ان کے سردار یہ کہہ کر ہمت دلاتے کہ اگر تم نے ان پر حملہ نہیں کیا تو پھر ان کے گھوڑے اور گھوڑوں کی زمین کیونکر ہاتھ آئیں گی، وہ حملہ کرتے وقت اتنے زور سے سورن (جنگی نعرے) لگاتے کہ ساری فضا میں لرزہ پیدا ہو جاتا، وہ بہادروں پر ہاتھوں میں سپر اور دوش پر کمان لٹکا

کیڑوں کی طرح رینگتے نظر آتے، اور چٹانوں کے گوشوں اور ریخوں پر پاؤں جماتے اور پرچڑھ جاتے، اور پہاڑ سے اتر کر نشیب میں اس طرح پھیل جاتے جیسے مٹی کے ڈھیر پر چیونٹیاں پھیل جاتی ہو یہ سوار بعض اوقات گھوڑوں سے اتر کر ان کی پیٹھوں کی آڑ لے کر دشمنوں پر تیر چلاتے، تیمور بھی ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوکر بڑی پامردی سے لڑتا، ایرانیوں کے خلاف جب معرکہ آرا ہوا تو شاہ ایران منصور اس کے گھوڑے کی طرف بڑھا، تیمور نے یہ دیکھکر اپنے نیزہ بردار سے نیزہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن نیزہ بردار پر غنیم نے اس طرح حملہ کر دیا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا، اور تیمور کو نیزہ نہ ملا، اس وقت اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا، لیکن ابھی وہ تلوار کھینچنے نہ پایا تھا کہ شاہ منصور اس کی طرف جھپٹا، اور اس کے سر پر دو وار کیے، تیمور نے سر پھیر لیا، منصور کی تلوار اس کے خود کو چھوتی ہوئی نکل گئی، اور خود سر سے گر کر تیمور کی گود میں آپڑا، مگر وہ خود گھوڑے پر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا، یکایک ایک تاتاری سردار اپنا گھوڑا تیمور اور منصور کے گھوڑوں کے بیچ میں لے آیا، جس سے شاہ منصور کو پیچھے ہٹنا پڑا،[1]

ہندوستان میں تیمور محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا، تو اس کے سوار محمود کے لشکر کے کوہ پیکر ہاتھیوں اور ان کے اژدہا نما سونڈوں سے بے حد ہراساں تھے، ان کو خبر ملی تھی کہ ہندوستان کے جنگی ہاتھی گھوڑوں اور سواروں کو سونڈ میں لپیٹ کر ہوا میں پھینک دیتے ہیں، اور زمین پر دے مارتے ہیں، اور ان پر تیر و شمشیر مطلق کام نہیں کرتے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو تیمور کے سواروں نے نڈر ہو کر ہاتھیوں پر حملہ کیا، اور ان کو گائے کی طرح ہر طرف دوڑا کر پریشان کر ڈالا، ظفر نامہ میں ہے:

"پیلان را باآں شکوہ ہیبت گاؤ صفت می راندند" (ج ۲ ص ۱۰۴)

محمود کے قلب لشکر میں ہاتھی ہی ہاتھی تھے، لیکن تیموری سواروں نے ان پر حملہ کرکے ان قوی ہیکل

[1] ظفر نامہ ج ۱ ص ۶۱۰ - ۶۱۳

جانوروں اور ان کے مہاوتوں کو تلواروں اور نیزوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا، ظفر نامہ میں ہے:

"و درمیان آن نہنگاں بے ستون ہیکل بچہار ستون رواں در آمدند و پیل بانان را از قلہ آن کوہہا نگو نسار ساختند، و بہ تیر و شمشیر خرطوم آن تندہا خلقت پیلان را مجروح می گردانیدند و می انداختند"

اسی لڑائی میں تیمور کے پندرہ سالہ شہزادہ خلیل سلطان نے ہاتھی کے مقابلہ میں بڑی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا، اور اپنی مردانگی اور شمشیر زنی سے ایک فیل بان کو مار کر اور ایک عظیم الجثہ ہاتھی کو گھیر کر تیمور کے پاس اس طرح لے آیا جیسے کوئی دہقانی بھینس کو ہانک کر لاتا ہو، ظفر نامہ کے مولف نے اس واقعہ کو قلمبند کر کے کچھ اشعار بھی لکھے ہیں،

....خیال ازیں چہ باشد دلیل — کہ طفلے ز خیلش سگالد بہ پیل

کجا بود شہزادہ ارجمند — ہم از پانزدہ سالگی پیل بند

ہنوز از لبش می دہد بوے شیر — چو شیراں کند پیل جنگی اسیر[1]

بابر کے سوار

بابر ہندوستان آیا تو اس کے پاس بہت تھوڑی سی فوج تھی جس میں زیادہ تر توپچی اور سوار تھے، لیکن سواروں میں وہ تمام جنگی مہارت و تنظیم اور حربی چستی و چالاکی موجود تھی، جو لڑائی کے لیے ضروری ہے، رانا سانگا کنواہہ کے میدان میں دو لاکھ دس ہزار فوج لیکر اترا تھا جس میں تقریباً ستر ہزار سوار تھے، اس کے مقابلہ میں بابر کے پاس کل آٹھ ہزار فوج تھی، لیکن وہ اپنے توپچیوں کی مستعدی اور ثابت قدمی اور اپنے سواروں کی تیز گامی اور قواعد دانی سے راجپوتوں کے انبوہ پر غالب آیا، آغاز جنگ سے پہلے بابر نے سواروں کے ایک چھوٹے دستہ کو غنیم کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا جس سے ایک ہلکی سی جھڑپ ہو گئی، اور جب یہ سوار اپنے

[1] ظفر نامہ ج ۲ ص ۱۰۸

نیزوں پر غنیم کے سر لاتے دکھائی دیے تو بابر کی پوری فوج کی ہمت بڑھ گئی، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ فتح و کامرانی ان کے قدموں کو چومنے کی منتظر ہے، میدان جنگ میں بابر نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ دائیں اور بائیں طرف بالکل کنارے یعنی تولقمہ اوج جبا تغار اور تولقمہ اوج برانغار پر سواروں کے منتخب اور چیدہ دستے کو کھڑا کیا اور اپنے قول کے راست و چپ توپوں کے ارابے کے پیچھے خاصہ کے شیر دل سواروں کی ایک صف ترتیب دی، جب لڑائی شروع ہوئی تو تولقمہ کے تیز گام اور برق رفتار سوار چکر کاٹ کر راجپوتوں کے عقب اور پہلو میں پہنچ گئے، اور ان کو نیزوں اور تلواروں سے ڈھکیل ڈھکیل کر توپوں کی زد میں لے آئے، اس طرح ہر بازو کے راجپوت سپاہی اپنی صفیں توڑ توڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے جس سے بابر کے گولہ اندازوں کو ان پر آتشیں گولوں کی بارش کرنے میں آسانی ہوئی، اور جب ساری راجپوت فوج گڈمڈ ہو گئی تو ارابے کے پیچھے سے بابری سوار کود کر آگے بڑھے، راجپوتوں کو اپنی کثرت کی وجہ سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا، پھر تو بابر کے تفنگچیوں اور سواروں نے مل کر راجپوتوں کو ڈھیر کر دیا۔[1]

بابر میں اپنی سپاہ کو حرکت میں لانے کی حیرت انگیز قابلیت تھی، لڑائی سے متعلق جتنی باتیں ہوتیں ان کو ذہن میں رکھتا، اور اپنے سرداروں کو طلب کر کے ان سے امور و طریقۂ جنگ پر بحث کرتا، پھر میدان جنگ میں تمام لشکریوں کو مل کر اس طرح کام کرنے پر آمادہ کرتا جس طرح شہد کی مکھیاں مل کر کام کرتی ہیں، چنانچہ جس کے ذمہ جس قدر کام ہوتا وہ اسے کامل طور پر انجام دیتا تھا، اور اگر کوئی لشکری اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرتا تو اس سے گھوڑے اور اسلحہ چھین لیے جاتے،[2] یا وہ اپنے عہدہ سے محروم کر دیا جاتا، یا اس کی داڑھی منڈوا کر اس کو سارے لشکر میں گھما کر ذلیل و رسوا کیا جاتا،[3] سنگین سزاؤں میں ناک کٹوا دی جاتی،[4] غداری کی سزائیں تو اور بھی سخت ہوتیں، غداروں

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھو بابر نامہ ص ۳۱۳-۱۴ ۲؎ بابر نامہ ص ۲۱۲ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً

کو سربازار قتل کر دینے کا حکم ہوتا،[1] اگر لشکری کسی معرکہ میں بددلی اور بزدلی کا اظہار کرتے تو بابر انکے سامنے موثر تقریریں کرکے ان کی غیرت و حمیت کو ابھارتا کہ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے، وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، اور جو دنیا میں آیا ہے وہ یہاں سے جائے گا، بدنام ہو کر جینے سے نیکنام ہونا بہتر ہے،[2]

بابر خود ایک بڑا جری شہسوار اور دلیر سپاہی تھا، اس نے ۱۹ سال کی عمر میں ۲۴۰ سواروں کی مدد سے سمرقند فتح کیا، تنہا پانچ پانچ سواروں کا مقابلہ کر کے ان کو زمین پر گرا کر ڈھیر کر دیتا، دونوں بازوؤں میں ایک ایک آدمی کو دبا کر ایک کنگرہ سے دوسرے کنگرہ پر جست کر جاتا،[3] ان سپاہیانہ اوصاف کے علاوہ ایک فوجی قائد کی جتنی خوبیاں کسی میں ہو سکتی ہیں، وہ سب اس میں موجود تھیں، سخت سے سخت مشکلات میں وہ مطلق نہیں گھبراتا، اور انتہائی صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرتا، ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء میں اندجان (فرغنہ) پر یورش کی تو ایک موقع کی جنگ کا حال اس طرح لکھتا ہے:

"شاید تین پہر رات گزری ہو گی کہ ایک دفعہ ہی غل غپاڑے کے ساتھ طبل جنگ کی آواز آئی، ہمارے ساتھی نیند میں تو تھے ہی، انھوں نے دشمنوں کی کمی بیشی پر خیال کیا، اور نہ ایک دوسرے کی خبر لی، دفعۃً سب کے سب بھاگ نکلے، مجھے بھی اتنی فرصت نہ ملی کہ ان لوگوں کو اکٹھا کروں، نگر میں باغیوں کی طرف چلا، میر شاہ قوچین، بابا شیرزاد، اور دوست ناصر میرے ساتھ تھے، ہم چاروں کے علاوہ سب بھاگ گئے، ہم تھوڑی دور آگے چلے تھے کہ وہ لوگ تیر مارتے اور غل مچاتے ہوئے ہم پر آ پڑے، ایک سوار جو قشقہ گھوڑے پر تھا، میرے قریب آ گیا، میں نے ایک تیر مارا، تیر گھوڑے کے لگا، گھوڑا فوراً مر گیا، وہ لوگ ذرا ٹھہر گئے، یہ تینوں آدمی جو میرے ہمراہ تھے، کہنے لگے کہ اندھیری

۱؎ بابر نامہ ص ۲۱۷ ۲؎ ایضاً ص ۳۰۹ ۳؎ طبقات اکبری جلد ۲ ص ۲۷

رات ہے، دشمنوں کی تعداد معلوم نہیں، اور سارا لشکر بھاگ گیا، ہم چار کتنے آدمی مار سکیں گے، یہاں سے چل دیجئے، پہلے بھاگے ہوؤں کو سمیٹیے اور پھر لڑیے، ہم دوڑے اور اپنے لوگوں میں پہنچے، ہر چند دوکا، چابک تک مارے اور ٹھہرانا چاہا مگر کوئی نہ ٹھہرا، آخر ہم ہی چاروں الٹے پھرے، اور تیر مارنے لگے، ادھر والے ذرا ٹھہر گئے، جب دو ایک دفعہ ہم کو انھوں نے دیکھا کہ تین چار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں تو پھر وہ ہمارے تعاقب میں اور گرانے میں مشغول ہوئے، اسی طرح تین چار دفعہ اپنے لوگوں کو میں نے ٹھہرانا چاہا، جب کوئی نہ رکا تو ناچار ان ہی تینوں کے ساتھ پلٹ کر ایسے تیر مارے کہ دشمنوں کا منہ پھیر دیا۔" (ص ۱۰۶ - ۱۰۵)

اس جنگ میں اس کو مراجعت کرنی پڑی، لیکن دوسرے سال اندجان (فراغنہ) پر پھر چڑھائی کی اور اس موقع پر جس جرأت اور پامردی سے لڑا اس کو پھر بیان کرتا ہے،

...... میرے سامنے جو دو آدمی آئے، ان میں ایک تنبل تھا، وہ بھی آگے بڑھا، بیچ میں ایک شاہراہ کے اس جانب سے اور وہ اس طرف سے آیا، یہیں ہم دونوں کا مقابلہ یوں ہوا کہ میرا سیدھا ہاتھ دشمن کی طرف اور تنبل کا سیدھا ہاتھ میری طرف ہو گیا، تنبل کے پاس گھوڑے کی زرہ کے علاوہ سارا سامان جنگ تھا، میرے پاس تلوار اور تیر کمان کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے کمان کو کان تک کھینچ کر ایک تیر جو میرے ہاتھ میں تھا، تنبل کو مارا، اس وقت ایک تیر شیبہ میری سیدھی ران میں لگا اور آر پار ہو گیا، میرے سر پہ لوہے کی ٹوپی تھی، تنبل نے جھپٹ کر تلوار کا ایک ایسا ہاتھ اس پہ مارا کہ میرا سر سن ہو گیا، اگرچہ ٹوپی کا تو ایک تار نہ کٹا، مگر میرا سر اچھی طرح زخمی ہو گیا، میں نے تلوار صاف نہ کی تھی، وہ کسی قدر زنگ آلود تھی، اس کے نکالنے کی مہلت نہ ملی، میں بہت سے دشمنوں میں اکیلا گھر گیا۔" (ص ۱۰۹-۱۰۸)

وہ اکیلا گھرا ہوا تھا لیکن پھر بھی اس کے دشمن اس کو زیر نہ کر سکے، وہ ہمیشہ سر بکف ہو کر

میدان جنگ میں اترتا، ۹۱۱ھ میں ہزارہ ترکمانوں کے خلاف جنگ کی تو لکھتا ہے:

...... محمد علی مبشر بیگ میرے ان امیروں میں تھا جن کو میں نے بنایا تھا، بڑا بہادر اور نہایت عمدہ سپاہی تھا، جہاں دشمنوں نے لکڑیاں ڈال رکھی تھیں، اس طرف بڑھا، دشمنوں نے اس کی گردن میں تیر مارا جس سے وہ فوراً ہلاک ہو گیا، چونکہ ہم نے حملہ کرنے میں بہت جلدی کی تھی، اس لیے اکثر جیبہ پہنے ہوئے نہ تھے، دو ایک تیر میرے سر پہ سے بھی گذرتے ہوئے گرے، احمد یوسف بیگ بار بار گھبرا کر چلاتا تھا کہ یوں ننگے کیوں گھسے جاتے ہو، میں نے دو تین تیر تمھارے سر پر سے جاتے ہوئے دیکھے ہیں، میں نے کہا گھبراؤ نہیں، ایسے تیر بہت سے میرے سر پر سے گذر گئے ہیں۔" (ص ۱۶۵ - ۱۶۴)

بابر کی اسی سرفروشی اور جانبازی کو دیکھ کر اس کے ہمراہی سوار اور لشکری اس کے ساتھ جلتی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے پانی میں کودنے کے لیے تیار رہتے، اور جہاں اس کا پسینہ گرتا وہاں وہ اپنا خون بہاتے،[1]

اکبر کے سوار بابر کی شجاعت، جانبازی اور پامردی اس کے جانشینوں کو بھی وراثت میں ملی تھی، اکبر شہسواری کے فن میں طاق تھا، وہ دن دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا اور مطلق نہ تھکتا، اس نے ایک بار آگرہ سے اجمیر تک ۹۰ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کی، اور پھر دوسرے دن واپس بھی ہو گیا،[2] وہ میدان جنگ میں تھوڑے سے سواروں کے ساتھ یورش کرتا تو صف اعدا میں بھگدڑ مچ جاتی، ۹۸۱ھ میں جب وہ محمد حسین مرزا گجراتی کے خلاف معرکہ آرا ہوا، تو محمد حسین مرزا کی طرف شاہ مرزا جرانغار پہ اور حبشیوں اور گجراتیوں نے برانغار پہ حملہ کر کے لڑائی کی آگ مشتعل کر دی، فریقین ایک دوسرے سے دست بگریباں تھے، کہ اکبر نے

---

[1] بابر نامہ ص ۲۹۲ [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۲۵۱

ایک خشم ناک شیر کی طرح اپنے سو سواروں کے ساتھ محمد حسین مرزا پر حملہ کیا، محمد حسین مرزا اکبر کا نام سنتے ہی بدحواس ہوگیا، اور میدان جنگ سے بھاگا، پھر بھی اس کے چہرہ پر زخم لگا، اور اس کا گھوڑا بھی گھائل ہوا، زقوم کی ایک جھاڑی راستہ میں ملی، اس نے اپنے گھوڑے کو جست کرانا چاہا، مگر وہ زخمی ہونے کی وجہ سے جست نہ کرسکا، اور ٹھوکر کھاکر گر پڑا، اور شاہی لشکریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، اس کی پسپائی دیکھ کر اس کے فوجی سرداروں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ میدان جنگ سے بھاگ نکلیں،[1]

اس سے پہلے ۹۷۹ھ میں اکبر کھبایت میں تھا کہ اس کو ابراہیم حسین مرزا کی مفسدانہ کارروائی کی خبر ملی، اس نے فوراً اپنے لشکر کا انتظام شاہزادہ سلیم، خواجہ جہاں اور قلیچ خان کے سپرد کیا، اور خود ۱۵۰ سواروں کی قلیل تعداد لے کر ابراہیم حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگیا، راجہ مان سنگھ، راجہ بھگوان داس، سید محمد خان اور شاہ قلی خاں جیسے آزمودہ کار اور چالاک سوار اس کے ساتھ تھے، قصبہ سترپال کے پاس دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی، ابراہیم حسین مرزا کے کثیر التعداد سواروں نے حملہ کرکے شاہی تیراندازوں کو درہم برہم کردیا، اکبر فوج کی کمی کی وجہ سے راجپوتوں کے ساتھ ایک ایسی تنگ جگہ پر کھڑا تھا جس کے دونوں طرف زقوم کی جھاڑیاں تھیں، اور تین سواروں سے زیادہ اس جگہ پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا ممکن نہ تھا، حریف کے تین سوار آہستہ آہستہ اس جگہ آئے، جہاں اکبر کھڑا تھا، راجہ بھگوان داس نے برچھے سے ان میں سے ایک کا مقابلہ کیا، اور اس کو بھگاکر دوسرے سوار کی طرف متوجہ ہوا، اکبر نے جو ابتک زقوم کی آڑ میں کھڑا ہوکر دشمنوں پر تیر پھینک رہا تھا، یہ دیکھ کر راجہ بھگوان داس کی مدد کے لیے گھوڑا دوڑایا، حریف اکبر کے حملہ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے ساتھی کے ساتھ بھاگا، اکبر فوراً

[1] فرشتہ ج، ص ۲۶۰

تیراندازوں کے ساتھ زقوم کی آڑ سے باہر نکل کر محمد حسین مرزا پر حملہ آور ہوا، مرزا کے لیے میدان جنگ تنگ ہوگیا اور وہ لڑائی سے منہ موڑ کر بھاگا، اس جنگ کا ذکر کرکے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب سے تاریخ کا پتہ چلتا ہے، اس وقت سے لیکر آج تک عرش آشیانی یعنی اکبر کے سوا کسی اور بادشاہ کے بارہ میں نہیں سنا گیا کہ اس نے اپنے لشکر جرار کو چھوڑ کر ایک قلیل جماعت کے ساتھ ایک تودۂ دشمن پر حملہ کرکے اپنے کو ایسے عظیم الشان خطرہ میں ڈالا ہو،[1]

ہاتھی اور سواروں کے مشترکہ تعاون سے اکبر صفِ اعداء میں جس طرح انتشار پیدا کردیتا تھا، وہ فن جنگ میں غیر معمولی ترقی کا ثبوت تھا، ۹۷۴ھ میں علی قلی خاں اور بہادر خان نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو رائے بریلی کے پاس گنگا کے ساحل پر وہ ان کی سرکوبی کے لیے پہنچا، پہلے ہاتھی پر بیٹھ کر اپنی فوج کو لڑاتا رہا، پھر ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوگیا، اور اپنے ہاتھیوں کو یکبارگی علی قلی کی طرف ہانک دیا، سب سے پہلے ہیرانند نامی شاہی ہاتھی علی قلی کی طرف دوڑا، غنیم کی طرف سے رودیانہ نامی ہاتھی مقابلہ میں آیا، ہیرانند نے رودیانہ کو زمین پر دے مارا، اس ہاتھی کے گرتے ہی سوار آگے بڑھے، اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی، اتفاق سے ایک تیر علی قلی خاں کو آکر لگا، وہ اس کو بدن سے نکال رہا تھا کہ ایک اور تیر اس کے گھوڑے کو لگا، گھوڑا تیر کھاکر ایسا کمزور ہوا کہ علی قلی خاں اس کی پیٹھ پر سے اتر آیا، اس کے ایک لشکری نے دوسرا گھوڑا حاضر کیا اور چاہا کہ علی قلی کو سوار کرے کہ یکایک نرسنگھ نام شاہی فیل نے پہنچ کر علی قلی خاں کو زمین پر پٹک کر کچل ڈالا، یہ دیکھکر اس کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے،[2]

بعض اوقات اکبر کے شاہی سواروں کا پورا دستہ اپنی جانبازی اور سپہگری میں جلتی ہوئی آگ میں کود پڑتا، قلعہ چتوڑ کے محاصرہ میں ساباط کے ذریعہ دوسرنگیں کھود کر برج تک پہنچادی گئیں،

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۶۰ – ۲۵۹ [2] ایضاً ص ۲۷۷

شروع ہوئی تو داؤد خاں کی طرف سے گوجر خان اپنے جنگی ہاتھی کو لے کر آگے بڑھا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے شاہی لشکر کے گھوڑے بھڑک گئے جس سے صف میں انتشار پیدا ہوگیا، خان عالم ایک نڈر اور تیز دم گھوڑے پر سوار تھا، وہ اپنی جگہ پر ثابت قدم اور جم کر لڑتا رہا، اور دشمنوں کو مار کر ڈھیر کر دیا، لیکن یکایک اس کے گھوڑے کو تلوار کی ایک ضرب لگی، اور وہ چراغ پا ہوا، خان عالم زین پر سے زمین پر آگیا لیکن انتہائی چستی اور مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر پھر اسی بامردی سے لڑنے لگا، مگر اس کی قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک ایک جنگی ہاتھی اس کے پاس پہنچ گیا، اور اس نے اسکو نرغہ میں لے کر زمین پر گرا دیا، اور دشمنوں نے اس کو گھیر کر ہلاک کر دیا لیکن مرنے سے پہلے اس کو فخر تھا کہ اس نے اپنے شاہی آقا کے ناموس کے لیے پوری وفاداری اور جانبازی سے جنگ کی (اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۲۴)

اسی لڑائی میں منعم خاں بھی گھوڑے ہی پر سوار ہو کر لڑا، اس کی پیشانی، گردن اور کندھوں پر متواتر ایسے زخم لگے کہ وہ مندمل بھی ہوگئے تو اس کی آنکھوں کی روشنی میں فرق آگیا، گردن گھما کر پیچھے دیکھنے اور سر تک ہاتھ لیجانے سے معذور ہوگیا، پھر بھی بڑی بڑی لڑائیوں میں شریک ہوتا رہا،[1]

عبد الرحیم خانخاناں کے بارہ میں فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ معرکہ جیت لینے میں شہرۂ آفاق تھا،[2] اکبر کے ۲۲ ویں سال جلوس میں مظفر گجراتی کے خلاف عبد الرحیم کو بھیجا گیا، تو احمد آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر سرکیج میں دونوں فوجوں کی مڈ بھیڑ ہوئی، مظفر گجراتی کے پاس چالیس ہزار اور عبد الرحیم کی کمان میں صرف دس ہزار سوار تھے، خود اکبر نے عبد الرحیم کو اس وقت تک جنگ سے روکنے کے لیے لکھا جب تک مزید کمک نہ پہنچ جائے، لیکن مرزا عبد الرحیم نے اپنی نبرد آزمائی کا زور دکھانے کی خاطر جنگ شروع کر دی، اور جب لڑائی انتہائی زور پر تھی تو عبد الرحیم ایک مقام پر سو لشکریوں

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۲۴ [2] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۰

ان میں بارود بھر کر آگ لگا دی گئی تھی، اتفاق سے ایک سرنگ میں آگ لگ گئی، جس سے اسکے نیچے کا برج اڑ گیا، اور قلعہ کی دیوار میں ایک بہت بڑا رخنہ پیدا ہوگیا، دو ہزار لشکری اور سوار یہ سمجھ کر کہ دونوں سرنگیں آگ سے جل گئی ہیں اور حصار میں دونوں طرف سے راستے بن گئے ہیں یکبارگی حصار کی طرف دوڑے، ایک ہزار لشکری پہلے رخنہ پر پہنچ کر راجپوتوں سے دست و گریباں ہوگئے اور ایک ہزار دوسرے برج کے پاس پہنچے، ان لشکریوں نے جب اس برج میں رخنہ نہ دیکھا تو کچھ تو کسی تدبیر سے پلٹ آئے، لیکن کچھ غنیم سے لڑنے لگے، عین لڑائی کے وقت سرنگ میں آگ لگ گئی، اور برج آگ سے یکایک اڑ گیا، طرفین کے سپاہیوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ادھر ادھر گرے، قلعہ کے محصورین میں سے بیشمار آدمی ہلاک ہوئے، شاہی لشکر کے بھی پانچ سو منتخب سوار کام آئے، لیکن بقیہ اور سواروں پر کسی قسم کی سراسیمگی طاری نہیں ہوئی اور وہ اسی دلیری اور بامردی سے قلعہ کا محاصرہ کیے رہے، اور دوسرے دن جب قلعہ میں داخل ہوئے تو راجپوتوں نے قلعہ کے اندر جم کر مقابلہ کیا، لیکن ان کے تقریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے، اور شاہی لشکر میں ایک آدمی کے سوا اور کوئی ہلاک نہیں ہوا،[1]

اکبر کے فوجی سرداروں میں خان عالم، منعم خان خانخاناں، عبد الرحیم خانخاناں، خان زماں اور بہادر خاں گھوڑے کی پیٹھ پر سے جنگ کرنے میں بڑے مشہور تھے، ۹۸۲ھ میں اکبر نے جب داؤد خاں کے خلاف شاہی فوج بنگال بھیجی، تو اس مہم میں ہراول کے سردار خان عالم نے بڑی بامردی اور شجاعت کا جوہر دکھایا، شاہی لشکر کی ابھی صفیں بھی درست نہیں ہوئی تھیں کہ خان عالم نے جوانی اور بہادری کے جوش میں جنگی قواعد کو پس پشت ڈال کر تیزی سے اپنا گھوڑا بڑھایا اور دشمن کی فوج میں گھس پڑا، منعم خاں خانخاناں نے اس کو اس سے روکا اور واپس بلایا، اور جب لڑائی

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۵۸-۲۵۷ اکبر نامہ ج ۳ ص ۳۱۳

اور ایک سو ہاتھی کو لیکر کھڑا تھا، کہ مظفر چھ سات ہزار سوار لیکر اس پر ٹوٹ پڑا، عبد الرحیم کی پامردی میں فرق نہیں آیا اور اس نے ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان کو مار بھگایا، اکبر نے اس کی اس جرأت اور بہادری سے خوش ہو کر پنج ہزاری منصب اور خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔[1]

۱۰۰۵ھ میں نظام الملک اور قطب الملک کی فوجوں سے اکبری فوج کا مقابلہ قصبہ اشتی کے پاس ہوا، تو اس موقع پر بھی عبد الرحیم خانخاناں نے حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دیا، وہ رات رات بھر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر فوج کی آراستگی اور نگرانی میں لگا رہتا، ایک موقع پر غنیم کے پچیس ہزار سوار خانخاناں کے پانچ ہزار سوار پر اچانک ٹوٹ پڑے، خانخاناں کے تمام ساتھیوں کی ہمت نے جواب دیدیا، اس کے ایک ساتھی دولت خاں لودی نے اس کو جنگ کرنے سے روکا، اور کہا کہ اس انبوہ سے مقابلہ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے، خانخاناں کی غیرت جوش میں آگئی، وہ بولا کہ تم یہ کہکر دہلی کے نام کو برباد کرتے ہو، دولت خاں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ دشمن کو شکست ہوئی تو سو دہلی آباد ہو جائے گی، لیکن اگر ہم لوگ ہلاک ہوئے تو پھر معاملہ خدا کے سپرد ہے، یہ کہکر اس نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھانا چاہا، سادات بارہہ کے بہادروں میں قاسم بارہہ نے یہ صورت حال دیکھی تو آگے بڑھا، اور دولت خاں کو روک کر بولا، "ہم ہندوستانی ہیں، لڑکر مرجانا ہمارا شیوہ ہے"، دولت خاں جھلا کر خانخاناں سے پھر مخاطب ہوا کہ یہی سہی دشمن کے انبوہ کے مقابلہ میں شکست لازمی ہے، لیکن یہ بتلاؤ کہ شکست کھا کے ہم لوگ تم سے کہاں ملیں"، خانخاناں مردانگی اور بہادری کے پندار میں بولا، "لاشوں کے ڈھیر کے نیچے" یہ سنکر سارے لشکریوں میں ایک نئی غیرت اور ہمت پیدا ہوگئی، اور وہ سر بکف ہو کر اس طرح لڑے کہ دشمن کی کثیر تعداد تتر بتر ہوگئی، خانخاناں نے اس غیر متوقع فتح و کامرانی کی خوشی میں میدان جنگ میں پانچ لاکھ روپے لٹائے۔[2]

۱ ماثر الامرا، ج ۱ ص ۷۰۰ ۲ ایضاً ص ۷۰۱

اکبری امرا میں خان زماں علی قلی کے بھائی بہادر خان کے بارہ میں فرشتہ لکھتا ہے کہ وہ اپنی معرکہ آرائی کے سامنے اسفندیار کی ہفت خوان داستان کو بھی ہیچ اور بے معنی سمجھتا تھا، شیر خاں ولد محمد شاہ عدلی نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جونپور کو مغلوں سے واپس لینے کے لیے دریائے گنگا کو عبور کیا تو اکبر کی طرف سے بہادر خاں نے لڑائی میں ایسے ایسے افغانیوں کو تہ تیغ کیا جن میں سے ہر ایک سوار اپنے کو ہزار ہزار سواروں کا ہم پلہ سمجھتا تھا،[1] خان زماں اور بہادر خاں دونوں ازبکوں کے سردار تھے، ازبک بڑے اچھے تیرانداز سمجھے جاتے تھے، مغل حکمراں زیادہ تر ان ہی کی جنگی شجاعت و تنند خوئی کی بدولت جنگ جیتا کرتے تھے۔

سادات بارہہ

سادات بارہہ بھی ہر فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ہر معرکہ میں انکی شہسواری اور نبرد آزمائی نمایاں رہتی، جہانگیر نے بھی اپنے عہد کی معرکہ آرائیوں میں ان کی جنگی خدمات کو سراہا ہے، وہ لکھتا ہے:

> "بارہ بزبان ہندی دوازدہ را گویند، چو درمیان دوآب دوازدہ دیہ نزدیک ہم واقع است کہ وطن ایں سادات است بنا بریں بسادات بارہہ اشتہار یافتہ اند وبعضے مردم در صحت نسب اینہا سخن ہا دارند، لیکن شجاعت ایشان برہانی است قاطع بر سیادت، چنانچہ دریں دولت ہیچ معرکہ نبودہ کہ اینہا خود را نمایاں ساختہ باشند و چندے بکار نیامدہ باشند، مرزا عزیز کوکہ ہمیشہ می گفت سادات بارہہ بلاگردان ایں دولت اند، الحق چنیں است"۔[2]

وہ "بلاگردانِ دولت" ہی نہیں رہے، بلکہ آخر میں "شاہ گر" بھی ہوگئے تھے، جہاندار شاہ کے بعد سید حسین علی خاں اور سید عبد اللہ خاں نے تیموری تخت پر جس کو چاہا بٹھایا اور جس کو چاہا معزول کردیا، ان کی تلوار اور نبرد آزمائی سے پوری سلطنت کانپتی تھی،

۱ فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۱ ۲ تزک جہانگیری ص ۳۶۴-۶۵

جہانگیر نے اپنے فوجی سرداروں میں سید عبدالوہاب، سید یعقوب اور سید غلام محمد کی تعریف خاص طور پر کی ہے۔ سید عبدالوہاب کو اس کے شجاعانہ کارناموں کی بدولت جہانگیر نے دلیر خاں کا خطاب دیا تھا[1]۔ ۱۰۳۲ھ میں جہانگیر کی فوج گجرات کی تسخیر کے لیے عبداللہ خاں کے خلاف بھیجی گئی، تو میدان جنگ میں سید غلام محمد نے بہادری کا پورا جوہر دکھایا، اور لڑتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ پر سے زمین پر گرا تو اس بہادر فوجی سردار کے بچانے کے لیے سو سواروں نے اپنی اپنی جانیں دیں[2]۔

جہانگیر خود تو کوئی غیر معمولی جنرل نہ تھا، لیکن اکبری روایت کے مطابق اس کے فوجی سرداروں اور ان کے ماتحت سواروں کا رعب تمام سلطنت میں بدستور سابق قائم رہا، اور یہ فوجی سردار جنگی تہور بھی اسی شان سے دکھاتے رہے، جہانگیر انکو بڑی محبت و شفقت سے مہم پر روانہ کرتا، اور کبھی انکو رخصت کرتے وقت خود گھوڑے پر سوار کرتا، اپنی دستار پہنا دیتا اور بغل گیر ہونے میں اشکبار ہو جاتا[3]، جس سے متاثر ہو کر یہ سردار پوری وفاداری اور جانبازی سے مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے، جہانگیر کے ۱۹ ویں سال جلوس میں اگر نگر میں افغانوں کے خلاف شاہی لشکر صف آرا ہوا تو اس کی کمان ابراہیم خاں کے ہاتھ میں تھی، اس کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے، بقیہ اور سوار دوسرے بازو پر متعین تھے، لڑائی شروع ہوئی تو دشمنوں نے ابراہیم خان کے لشکر کے دوسرے بازووں کو درہم برہم کر دیا، ابراہیم یہ دیکھ کر تاب نہ لا سکا اور بے قرار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اس سے اس کی ساری فوج کی تنظیم بگڑ گئی، اور جب ابراہیم خاں کے ساتھیوں نے اس کی جان خطرہ میں دیکھی، تو اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اس کو میدان کارزار سے نکال لینا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا، اور بولا کہ میدان جنگ سے منہ موڑنا مردانگی نہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا دولت حاصل ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں اپنی جان نثار کردوں۔" پھر متواتر زخم کھا کر مردانہ وار جان دیدی، (تزک جہانگیری ص ۳۹۳)

[1] تزک جہانگیری ص ۴۷، ۳ [2] ایضاً ص ۳۶۳ [3] مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۰۸،

جہانگیر کے فوجی سردار جب بہادری کے کارنامے انجام دیکر میدان جنگ سے لوٹتے تو وہ ان کی شجاعت کی نوعیت کے لحاظ سے انکو خطاب دیتا، مثلاً فدائی خاں، زبردست خاں، ہمت خاں، دلاور خاں، دلیر خاں، داراب خاں وغیرہ، یہ دستور اور تیموری حکمرانوں کے عہد میں بھی رہا،

شاہجہانی عہد کے سوار | شاہجہانی عہد میں مغل فوجوں کی سربلندی میں اضافہ ہوتا رہا، انھوں نے اپنی نبرد آزمائی اور سپہگری کے جوہر بدخشاں بلخ اور قندھار میں بھی جا کر دکھائے، ۱۰۵۵ھ میں شہزادہ مراد بدخشاں و بلخ کی مہم پر بھیجا گیا تو اس کی کمان میں پچاس ہزار سوار اور دس ہزار تفنگچی اور پیادے تھے[1]، ان کی سربراہی تقریباً ڈھائی ہزار پرانے تجربہ کار فوجی سرداروں کے ذمہ تھی، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، علی مردان خان، نجابت خاں، قلیچ خاں، لہراسپ خاں، دولت خاں، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ، شاہجہاں نے اس لشکر کا راستہ یہ متعین کیا کہ وہ کھوکھروں کے علاقہ، اٹک، اور حسن ابدال ہو کر جائے، کیونکہ ان علاقوں میں فوجی رسد کی کمی نہ تھی، اور جب موسم بہار شروع ہو تو شہزادہ مراد پشاور ہو کر کابل روانہ ہو، اور فوج کے دوسرے سردار بنگش کے زیریں حصہ سے ہو کر شہزادے سے کابل میں ملیں، اور جب فوجیں کابل میں جمع ہو جائیں تو کچھ سردار مثلاً قلیچ خاں، خلیل اللہ خاں اور مرزا نوروز اور کہمرد اور غوری پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں، اور بقیہ تمام لشکر بدخشاں اور بلخ کی طرف جائیں، شہزادہ مراد مقررہ وقت کے بعد کابل پہنچا تو اس وقت درہ طول برف سے ڈھکا ہوا تھا، کچھ دستے ان برفانی راستوں کو صاف کرنے کے لیے آگے روانہ کیے گئے، شہزادہ مراد تین منزلوں پر قیام کرنے کے بعد جاری کاران پہنچا، یہاں سے قلیچ خاں کی سربراہی میں ایک دستہ غوری اور کہمرد کی طرف بھیجا گیا، اور شہزادہ نے بدخشاں کے جانب کوچ کیا، قلیچ خاں کو راستہ بہت تنگ اور دشوار گذار ملا، اس لیے اس نے اپنی

[1] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۴۸۳

فوج کے کئی ٹکڑے کرکے کوچ کو جاری رکھا، اور کہمرد اس طرح اچانک پہنچا کہ وہاں کے باشندے اپنی مدافعت میں کچھ نہ کرسکے، وہاں دو روز ٹھہر کر غوری پہنچا، تو یہاں بھی شاہی لشکر کا کسی نے مقابلہ نہ کیا، شہزادہ مراد کو برفانی راستہ طے کرنے میں دیر لگی، درہ طول کے برف کو ہزار ہزار مزدور صاف کرتے تو سوار اور دوسرے لشکری کچھ آگے بڑھتے، بالآخر شہزادہ سراب پہنچا، یہاں پوری فوج اکٹھی ہوئی، اور وہ دیہ تاجکان ہوتی ہوئی نارین پہنچی، یہاں سے بڑھ کر اصالت خاں کی نگرانی میں سواروں نے قندز پر قبضہ کرلیا، قندز چھوڑتے وقت غنیم نے بڑی لوٹ مار اور غارتگری کی، مراد نے پہنچکر وہاں کے باشندوں کے نقصانات کی تلافی میں پچیس ہزار روپیے تقسیم کرائے،

قندز کے قبضہ سے بدخشاں شاہجہاں کے حدود سلطنت میں آسانی سے آگیا، اور اب شاہی لشکر بلخ کی طرف بڑھا، یہ سیل رواں کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا، ان لشکریوں کی شجاعت اور نبرد آزمائی کا شہرہ وہاں تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا، اس لیے وہ کسی رکاوٹ اور مقابلہ کے بغیر کوچ کرتے ہوئے بلخ کے دروازے تک پہنچے، تفنگچی سواروں کو اپنی آڑ میں لے کر بلخ کے اندر گھسے، والی بلخ قلعہ کے اندر تھا، لشکر جرار کی آمد پر قلعہ چھوڑ کر فرار ہوگیا، اوزبک اپنی نبرد آزمائی کے لیے مشہور تھے، لیکن مراد کی فوجوں اور سواروں کی وہ بھی تاب نہ لاسکے، اور بلخ اور اس کے بعد ہی قلعۂ ترمذ پر شاہجہانی پرچم لہرانے لگا، شاہی فوج کے تمام دستے جب بلخ کے اندر داخل ہوئے ہیں تو وہاں کے باشندے اس لشکر کی آرائش و نمائش کو دیکھکر دنگ رہ گئے، کوہ پیکر اور برق رفتار ہاتھیوں پر مخمل اور زربفت کی جھولیں پڑی تھیں، لشکریوں کی سیمیں اور طلائی لباس سے چمک دمک پیدا ہورہی تھی، گھوڑوں کے زین اور لگام بھی زریں تھے، زرنگار اور مرصع جھنڈے اور علموں کی کثرت تھی، توپچیوں اور تفنگچیوں اور باندازوں کا بھی بڑا انبوہ تھا، اہل بلخ نے اس شان و شوکت کا لشکر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا،[1] جب اس فتح کی خبر شاہجہاں کو پہنچی تو اس دیرینہ آرزو کی خوشی

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۵۳۱

میں آٹھ روز تک شاہانہ جشن منایا، فوجی سرداروں کے مناصب بڑھائے گئے، ان کو خلعت اور انعامات دیے گئے، اور شعراء نے قصائد تہنیت مبارکبادی پیش کی،[1]

مراد تو بلخ سے واپس چلا آیا، لیکن شاہجہاں کے حکم سے سوار اور فوج کے کچھ اور دستے خاص خاص مقامات پر متعین کردیے گئے، مشرق کے جانب طالقان اور قندز میں، شمال مشرق کے سمت رستاق میں دریائے جیحون پر بلخ اور ترمذ میں، بلخ کے شمال میں میمنہ اور شمال مغرب کیجانب اندخود میں شاہجہانی سوار ہندوستان کا پرچم لہرایا، مراد کی واپسی کے بعد شہزادہ اورنگ زیب بلخ بھیجا گیا، اسکے جلو میں ۳۵ ہزار فوج تھی جس میں زیادہ تر سوار ہی تھے، اس زمانہ کا بڑا تجربہ کار فوجی جنرل امیر الامراء علی مردان خاں بھی اسکے ساتھ گیا، اورنگ زیب پشاور ہوتا ہوا کابل پہنچا، جب کابل سے آگے بڑھا تو اسکے کچھ فوجی سردار اپنے لشکریوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے، اوزبکوں نے شاہی لشکر پر تاخت کرکے اس کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی، ان کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ مسلح سوار تھے، لیکن وہ میدان جنگ میں کھل کر لڑنے کے بجائے دشوار گذار راستوں اور پہاڑی علاقوں میں چھپ چھپ کر حملہ کرتے رہے، اس قزاقانہ جنگ کے مغل سوار عادی نہ تھے، لیکن اورنگ زیب کے سپاہیانہ تدبر اور احتیاط سے لشکر آگے بڑھتا چلا گیا، اوزبک حملہ کرتے اور مار کھا کر بھاگتے رہے، انکے چھ ہزار سوار مارے گئے اور شاہی فوج کے پانچ سو سواروں کی جانیں تلف ہوئیں، اورنگ زیب راستہ میں جوشن پہنے اور سر سے ہمیشہ مسلح فوج کی نگرانی میں مشغول رہتا تھا، وہ درہ شبر اور آق رباط ہوکر کہمرد کی طرف بڑھ رہا تھا کہ درہ گز کے پاس اوزبکوں نے پھر مزاحمت کی مگر اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی اچھی طرح کردی، اور وہ شکست کھا کر دروں، پہاڑیوں اور گذرگاہوں کی کمین گاہوں میں چھپ گئے، اورنگ زیب اوزبکوں کی قزاقانہ جنگ کے طریقوں سے کچھ واقف ہوگیا تھا، اس لیے آگے بڑھا تو درہ گز سے ہوکر بلخ کو جانے والے دریائے آب کی ناکہ بندی اچھی طرح کردی،

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۵۳۱

پہلے علی مردان کو ہراول بنا کر آگے بھیجا، اس کے ساتھ "شیران زنجیر خا" "دلیران جوشن قبا" "بہادران نبرد پرداز" اور "تفنگچیان حکم انداز" تھے، اس کے پیچھے اورنگ زیب اپنے توپچیوں، جنگی ہاتھیوں، اور منتخب لشکریوں کے ساتھ روانہ ہوا، اوزبکوں نے ہراول پر تاخت کی، مگر زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کہ علی مردان کے "صف شکن" "مرد افگن" سواروں نے اپنی تیغ آبدار اور سنان آتشبار سے ان کو منتشر کر دیا، اور دو کوس تک ان کا تعاقب کر کے ان کو پیچھے ڈھکیل دیا، اس کے بعد اورنگ زیب کو بلخ پہنچنے میں دیر نہیں لگی، بلخ میں کچھ احدی، سوار، پیادے اور تفنگچی چھوڑ کر وہ پوری تنظیم و ترتیب کے ساتھ آقچہ کی طرف بڑھا، پہلے تفنگچی بڑھ کر راستے کو محفوظ کر دیتے، انکے پیچھے سوار کوچ کرتے، کیونکہ اوزبک باغوں اور نہروں میں چھپ چھپ کر ان پر مسلسل تیر اندازی کر کے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیتے تھے، لیکن یہ سر بکف فوج بڑھتی چلی گئی اور تیمور آباد پہنچی، اوزبک شہسواری اور تیراندازی میں بے مثل مہارت رکھتے تھے لیکن شاہجہانی فوج کی تنظیم و ترتیب، تیز گامی اور ان سب پر مستزاد، شہزادہ اورنگ زیب کی سپہ سالاری اور بیدار مغزی سے ان کا سارا تہور شورش بے مدعا بن کر رہ جاتا، وہ چھپ چھپ کر شاہی فوج کے کمزور حصہ پر اچانک حملے کر دیتے لیکن اورنگ زیب فوراً کسی ہوشیار اور بہادر جنرل کو بھیجکر یا خود پہنچکر ان پر ضرب کاری لگاتا، اثنائے راہ میں ایک مقام پر فریقین میں جو تصادم بھی ہوا اس کا حال خافی خاں نے اس طرح لکھا ہے کہ چاول جرانغار سعید خاں کی نگرانی میں تھا، وہ بیماری کے ضعف کی وجہ سے گھوڑے پر بمشکل سوار ہو سکتا تھا، اوزبک اس کے بازو پر اچانک حملہ آور ہو گئے، سعید خاں نے پانچ سو سوار ان کے مقابلے کے لیے بھیجے لیکن وہ مغلوب ہو گئے، پھر سعید خاں نے اپنے دو لڑکوں لطف اللہ خاں اور خان زمان خاں

له بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۶۷۳-۶۷۱

کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، یہ دونوں بڑی بہادری سے لڑے لیکن اوزبکوں کو مغلوب نہ کر سکے اور باپ سے کمک منگوا بھیجی، اس مرتبہ سعید خان خود علالت کے باوجود جنگی نعرے لگاتا ہوا فوج کے ساتھ آگے بڑھا، اس نے اپنی تلوار سے قیامت بپا کر دی لیکن اس کے گھوڑے کے پاؤں لڑکھڑا گئے جس کی وجہ سے وہ زخمی ہو کر زین سے زمین پر آگیا، اس کے کئی زخم لگ چکے تھے، پھر بھی وہ زمین سے تیزی سے اٹھا، اور تین چار دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کا لڑکا لطف اللہ خاں باپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا، تیروں کی بارش ہر طرف ہو رہی تھی، پھر بھی وہ اپنا گھوڑا باپ کی طرف لے چلا، یکایک ایک تیر آکر لگا، اور لطف اللہ گھوڑے سے گر کر جان بحق ہو گیا، سعید خاں کے دوسرے لڑکے خان زاد خان نے بھائی کو اس طرح مرتے دیکھ کر باپ کو بچانے کے لیے مردانہ وار گھوڑا بڑھا دیا، اور دشمنوں کو مارتا کاٹتا جا رہا تھا کہ تیروں کے متواتر زخم کھا کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا، اورنگ زیب کو اپنے فوجی سرداروں کی پسپائی کی خبر ملی تو ہاتھیوں، تفنگچیوں اور سواروں کا ایک دستہ لے کر ان کی مدد کو پہنچا، اور کوس و کرنا کا شور ایسا بلند ہوا کہ گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی، اورنگ زیب نے دو مست ہاتھی دشمن کی طرف چھوڑ دیئے، اور ان کے پیچھے شیر دل سواروں نے ایسی یورش کی کہ اوزبک نہ ٹھہر سکے، اور ان کے کشتوں کے پشتے لگ گئے، سعید خاں کے نوکر اس کے پاس پہنچکر اس کو اور دونوں لڑکوں کو میدان جنگ سے باہر لائے، خان زاد خان میں رمق جان باقی تھی، اس نے اشارہ اور لکنت سے باپ کا حال دریافت کیا، اور اس کی روح بھی عالم بالا میں پرواز کر گئی، تھوڑی دیر بعد باپ بھی راہی عدم ہوا[1]،

اورنگ زیب اس طرح لڑتا بھڑتا علی آباد پہنچا، یہاں اس کو خبر ملی کہ دشمنوں کی ایک فوج

له خافی خاں حصہ اول ص ۶۶۲-۶۶۳

بخارا سے بلخ کی طرف بڑھ رہی ہے، اس نے بلخ کی طرف مراجعت کرنا بہتر سمجھا، ازبکوں اور بلخ کے لشکریوں نے اورنگ زیب کے بلخ تک پہنچنے میں ہر قسم کی مزاحمت کی، اور جب اورنگ زیب پاشائے اور شیخ آباد ہو کر فیض آباد پہنچا تو دشمنوں سے پھر زبردست مقابلہ ہوا لیکن اورنگ زیب کی تربیت یافتہ فوج غالب آئی، اور اورنگ زیب بلخ میں داخل ہو گیا، بلخ سے روانگی اور واپسی کی مدت کل دس روز کی تھی لیکن اس اثنا میں لشکریوں نے مطلق آرام نہ لیا، ان کا کھانا ہاتھی کی پیٹھ پر تیار کیا جاتا تھا، رات رات بھر فوجی سردار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر لشکر کے چاروں طرف خندقیں کھدواتے اور انکی نگرانی کرتے، کھانے پینے کی چیزوں کا بھی قحط پڑ گیا تھا لیکن اورنگ زیب کی مدبرانہ قیادت، دلیرانہ رہنمائی اور سپاہیانہ احتیاط نے لشکر میں انتشار اور بد دلی پیدا نہ ہونے دی، اور اس کی ہمت، جرأت اور پامردی نے ہر وقت اس کا ساتھ دیا، وہ ازبکوں کے خلاف ایک موقع پر لڑ رہا تھا کہ دشمنوں نے مور و ملخ کی طرح اس کو گھیر لیا، اس گھمسان لڑائی میں ظہر کا وقت آ گیا، اورنگ زیب گھوڑے پر سے اتر آیا اور نماز با جماعت کا قصد کیا، اس کے مقربین نے میدان کارزار میں اس طرح نماز ادا کرنے سے روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانا اور تیروں کی بارش میں پورے اطمینان و سکون سے فرض، سنت اور نفلیں ادا کیں، ازبکوں کے سردار عبد العزیز کو اس کی خبر ملی تو وہ بہت حیران ہوا اور یہ کہکر جنگ سے ہاتھ روک لیا کہ ایسے شخص سے جنگ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے،

"با چنیں کسے در افتادن بر افتادن ست"[1]

(باقی)

---

[1] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۱

رقعات عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کیے گئے ہیں، ان سے علم، ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت للعہ

(مرتبہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی)

"منیجر"

سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از

(جناب محمد اشرف خاں ایم اے، لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور)

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ کی ذات علم ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی جامع تھی، اگرچہ آخر عمر میں ان پر طریقت کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن اس سے انکی علمی حیثیت اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، لیکن ان کے وہ روحانی مسترشدین جنھوں نے انکو صرف آخری چند سالوں میں دیکھا ہے اور ان کو ان کی صحبت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، ان کو محض ایک شیخ طریقت کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو ان کی زندگی کی محض اک رخی تصویر ہے، اس مضمون میں بھی یہ غلو ہے، لیکن اس سے سلوک و تصوف کے علاوہ ان کے مختلف افکار و خیالات، اقوال و ملفوظات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے، جس کو ناظرین معارف شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

سید الملت حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جنھیں ان کی جامعیت، ہمہ دانی، اور گوناگوں کمالات و فضائل کی بنا پر فرد کے بجائے امت کہا جائے تو بجا ہو گا، شبلیؒ کا یہ جانشین تنہا اورنگ علم و تحقیق ہی کا مسند آرا نہ تھا، بلکہ فقر و سلوک کی بھی زینت تھا، اگر سلیمان اعظم کی علمی فتوحات کا علم اسلامی علوم و فنون کی قلمرو پر نصب تھا، تو اس کے قلم کا فیضان سیرت علیہ کے کوثر و تسنیم سے کام و دہن کو لذت بخش رہا تھا، اور اس کا فیضِ صحبت تربیت و تزکیہ کی سنت کو پورا

کر رہا تھا. اگر ایک طرف کلک سلیمانی نے علوم اسلامیہ کے خزائن کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف عارفانہ رموز و حقائق اور قلبی اسرار و دقایق کو بھی فاش کیا، ظاہر و باطن کے اس مجمع البحرین کے فضائل و کمالات اسقدر مختلف النوع ہیں کہ انسان اس کی وسعت و گہرائی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا معجز نما قلم جس موضوع پر بھی اٹھا ہے اس کے جملہ پہلوؤں کو اپنے تلاش و تحقیق، وسعت نظر، حقیقت رسی، اور ژرف نگاہی سے اس طرح سمیٹتا چلا گیا ہے کہ اس کی تحقیقات حرف آخر بن گئی ہیں، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری علوم کی عظمت و تابانی کی بنا پر عموماً سلوک سلیمانی کی طرف کم نگاہیں جاتی ہیں، حالانکہ اگر اس فن کے متعلق آپ کے مکاتیب و ملفوظات سے سلوک سلیمانی کو مرتب کیا جائے تو بحمد اللہ تعالیٰ اتنا کافی مواد مل سکتا ہے جس سے طریق کے متعلق حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نظریات پوری طرح روشن ہو جاتے، حضرت والا کا یہ وہ اہم پہلو ہے جو عوام تو کیا عموماً خواص کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہے۔

کاش حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اشرف الحیات[1] مکمل ہو جاتی، تو سلوک سلیمانی اپنی پوری تابانی سے ظاہر ہو جاتا، لیکن یہ حکمت الٰہی میں مقدر نہ تھا، اگست ۱۹۵۳ء میں جب کتاب مذکور کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی گئی تو کس عارفانہ انداز میں فرمایا تھا کہ "کہاں کی تحریر و تصنیف، دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کس سے راضی ہوتے ہیں"،

مولانا تھانویؒ کے متعلق مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور مولانا دریا بادی کی تصانیف کے بعد حضرت کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ تصوف کی حقیقت کو نئی پود کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے

[1] کتاب مذکور کا مقدمہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ کی کتاب تجدید تصوف و سلوک کے ساتھ چھپ چکا ہے، کچھ صفحات (غالباً ۴۰ - ۵۰) مسودے کی صورت میں سید سلمان سلمہ کے پاس موجود ہیں، جو "تبرک سلیمانی" کی حیثیت سے اشاعت کے قابل ہیں، مزید براں بعض ایسے فوائد بھی اس میں موجود ہیں جو دیگر کتابوں میں نہیں ملتے۔

کلک سلیمانی کی ضرورت ہے، تو ارشاد فرمایا "جی ہاں! وہ حضرات اپنا کام پورا کر چکے لیکن میں مکمل نہ کر سکا"،

ایک طالب نے عرض کیا کہ حضرت حیاتِ شبلی لکھ کر آپ استاد کا حق ادا کر چکے، اگر اشرف الحیات پوری ہو جاتی تو شیخ کا حق بھی پورا ہو جاتا، کس سوز و درد سے فرمایا "حق کیا ادا ہوتا"، تاہم حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعۂ غزلیات "غزل الغزلات" میں تصوف کے متعلق کچھ تعلیمات نظم ہو گئی ہیں، جن کی تشریح حضرت والا نے اس ناکارہ کے سامنے فرمائی تھی، افسوس میں اپنی بدنصیبی کی بنا پر انھیں قلمبند نہ کر سکا ورنہ خود شیخ کی زبانی سلوک سلیمانی کا نادر مجموعہ ہوتا، اشعار کا یہ مجموعہ مولانا تھانویؒ کے تعلق سے بعد کا ہے، فرماتے تھے "یہ میرا غزلنامہ نہیں بلکہ سفرنامہ ہے" یعنی حضرۃ الشیخ رحمۃ اللہ علیہ کی سیر سلوک کا مختصر روزنامچہ ہے جس میں سید الملتؒ نے مختلف منازل سلوک کی طرف اشارہ کیے ہیں، ارشاد ہے،

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں — اب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں

دیوانگانِ عشق کو دیکر صلائے عام — آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

غلبۂ حال کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ "انسان پر جس چیز کا خیال چھایا ہوتا ہے وہی چیز سنائی اور دکھائی دیتی ہے، میں ایک مرتبہ لکھنؤ سے بھوپال جا رہا تھا، غلبۂ ذکر کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریل سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ بھی الا اللہ الا اللہ کہہ رہی ہے، چنانچہ یہ شعر موزوں ہو گیا،

کوئی ہو آواز میرے کان میں — ہر صدا آواز الا اللہ ہے

اور پھر پوری غزل نظم ہو گئی"، اس غزل کی کیف انگیزیوں کا اندازہ صرف ایک شعر سے کیجئے،

وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں — جام مے آواز الا اللہ ہے

اس واقعہ کی نقل سے مقصود یہ ہے کہ شیخ وقت کی "واردات عشق" کیونکر سپرد قلم ہو جاتی تھیں، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "میں یوں ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا، جب تک خاص حالت نہ ہو،

ایک صاحب میر تخلص غزلوں میں ڈھونڈ رہے تھے، میں تخلص سے خلاص ہوں، میری شاعری میں کوئی جدت نہیں، البتہ یہ نئی بات ہے کہ تخلص نہیں، جو چاہے گا ان اشعار کو اپنی جانب منسوب کرلیگا، اللہ میاں کا بھی تو کوئی تخلص نہیں ......

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ پر جس زمانہ میں عقل کا غلبہ تھا، اس دور کی شاعری کو جو بجائے خود سراپا عشق و ذوق کا وجد اور نغمہ ہے، دماغی شاعری قرار دیا ہے، ایک مرتبہ اپنا یہ شعر سنا کر

آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس　　ہائے اس گنگا جل کو کیسے زمزم کوثر کروں

فرمایا "میں نے اپنی شاعری کے تین حصے کیے ہیں، ایک نفسانی شاعری، دوسری تحیر کی، تیسری دماغی شاعری۔ یہ دوسرے دور کا شعر ہے،

ایک مرتبہ میں نے عرض کی کہ خواجہ مجذوب کے اشعار میں عجیب مستی ہے، فرمایا "جی ہاں! وہ پی کر مست تھے اور ہم بے پئے ہی مست ہیں،" اس سے مراد یہ تھی کہ خواجہ صاحب پر ہر وقت سرشاری کا عالم اور جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی، اور حضرت والا تمکین وضبط کے باوجود عشق الٰہی میں مست تھے جس کا اظہار حضرت کے اس شعر سے ہوتا ہے:

تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں　　دل سراپا جوش ہے لیکن زبان خاموش ہے

ایک مرتبہ فرمایا میں نے اپنا یہ شعر

اندرون حلقۂ پیر مغاں　　کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے

دہلی صاحب کو لکھ کر بھیجا اور ان سے پوچھا، مجذوب کو تو سب جانتے ہیں، سالک کون ہے، سالک سے غالباً خود حضرت والا کی ذات مراد تھی، کیونکہ یہاں جذب وسکر پر ضبط وصحو غالب رہتا تھا، اور جب کبھی عشق ذوق وشوق غالب ہوجاتا تھا تو اس قسم کے اشعار نکل جاتے،

زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں سے پی　　گفتار ہے مستانہ، کردار ہے رندانہ

اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

الاماں اے سوزش داغ فراق　　روز محشر تابش خورشید ہے

میکدہ مسجد میں یاد آیا گیا　　روز افزوں نشۂ توحید ہے

چشم ساقی میں بھری کیا بادۂ پرجوش ہے　　جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست بے ہوش ہے

پھیر دے اے چشم ساقی گردش ایام کو　　یعنی امشب میری ہو جائے جو میرا دوش ہے

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس　　ہوش جو تھا بیہشی ہے، بیہشی اب ہوش ہے

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے　　مجھکو دیوانہ بنایا کس نے

دل اس پیری میں بھی غرق ہوسناکی ورندی ہے　　پھنسی ہے کشتی عمر رواں گرداب ساحل میں

مرے ہوش وخرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں　　لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل میں

لیکن ان اشعار سے بھی ان کیفیات باطنی کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکیں　　شوق بے اندازہ، پیچیدہ وہ درد دل میں ہے

سلوک سلیمانی کی روشنی تمام تر مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس تھی، اور وہ بیرونی اثرات سے بالکل پاک تھا، سیرت نگار نبوی کے نزدیک تصوف سنت نبوی کے کامل ظاہری اتباع کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال قلبیہ اور اعمال باطنیہ کی پوری پوری پیروی کا نام تھا، ارشاد فرماتے تھے:

"لوگ سمجھتے ہیں کہ اتباع نبوی میں صرف ظاہری اتباع کافی ہے، سیاہ پگڑی باندھ لی، سرمہ لگا لیا، تہبند نصف ساق تک اونچا کرلیا، اور اتباع مکمل ہوگیا، ظاہری اتباع کی نفی نہیں کرتا، لیکن اتباع نبوی میں .... باطنی اتباع بھی ضروری ہے، احوال میں اتباع ہو، کیفیات قلبی میں اتباع ہو، باطنی اتباع بھی تو ضروری ہے، اس کی طرف توجہ نہیں،"

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے تھے، وہ ظاہر وباطن، جسد وروح، جسم وقلب کے جملہ

احوال کی اصلاح و تربیت کا جامع و مانع دستور العمل تھا، اگر تلاوت قرآن، تعلیم کتاب و حکمت نبوی
اس کے طریق تربیت کا ایک پہلو تھا، تو دوسرا اہم پہلو تزکیۂ قلوب و صفائی نفوس بھی تھا کہ انبیاء علیہم السلام
کے طریق دعوت و تربیت میں قلوب کی اصلاح، روح کے تزکیہ اور نفس کی تطہیر کی اہمیت ظاہری اعمال
کی پابندی سے کسی طرح کم نہیں، باطن ہی وہ سرچشمہ ہے، جو اگر صاف و پاک ہو جائے تو رگ رگ
ایمان و یقین اور اعمال صالحہ کے آب حیات سے زندہ اور توحید و تقویٰ کے نور سے معمور ہو جاتی ہے،
اور اگر یہ سرچشمہ عقائد باطلہ و خیالات فاسدہ سے گدلا رہے تو اعمال ظاہر کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی،
آیات قرآنی اور احادیث نبوی باطنی احوال و اصلاح کی تصریحات و اشارات سے مملو ہیں، اور بہ
بقول شخصے "مجھے تو کوئی ایسی آیت و حدیث نظر نہیں آئی جس میں تصوف نہ ہو" حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ
نے ایک مولوی صاحب سے جو تصوف و سلوک کے قائل نہ تھے، راقم کی موجودگی میں طریق کی اہمیت
پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا،

"علوم دو طرح کے ہیں، ظاہری و باطنی، دونوں قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، ظاہری و
باطنی علوم کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری علم کے بتانے والے اور ہوں اور باطنی کے دوسرے، بلکہ اس کی
مثال یہ ہے، ایک شخص نماز نہیں پڑھتا، اسے بتایا جائے کہ نماز فرض ہے، یہ ظاہری علم ہے، باطنی وہ ہے
جو اعمال قلب سے متعلق ہے. جیسے ریا، کبر، حب جاہ وغیرہ قلب کے امراض ہیں، امراض قلب کو امراض
باطنی کہتے ہیں، اور جو علوم امراض باطنی سے متعلق ہیں انھیں علوم باطنی کہتے ہیں، بغض، ریا، کینہ
وغیرہ بری چیزیں ہیں، ان کا علاج کیوں نہ کیا جائے، حدیث میں ہے ان الحسد یاکل الحسنات
اسی طرح ایک شخص نماز پڑھتا ہے، دیکھا جائے نماز میں اس کی روح بھی ہے یا نہیں، بتایا جائے
خشوع کیونکر حاصل ہو، جس طرح علم ظاہری ضروری ہے اسی طرح علم باطنی بھی ضروری ہوا، اور
نصوص سے ثابت؛"

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خلفائے راشد جو آپ کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے، تعلیم کتاب
وسنت کے ساتھ تزکیۂ روح و اصلاح قلب کی دولت سے بھی نوازے گئے کہ اس کے بغیر نبوت کی نیابت
کا پورا فرض انجام نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ ظاہر و باطن کی جامعیت کے بغیر انسان کی کامل
اصلاح محال ہے، سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول "باطن کی صفائی اور قلب کی تابانی کے بغیر محض
زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سراب کے نمونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی"۔

قلب و باطن کی اس اہمیت کی بنا پر وہ قدسی صفات ہستیاں جن کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام
کی دعوت و پیغام کو عالم میں پھیلایا گیا، زندہ و روشن دلوں اور نورانی روحوں کی حامل رہی ہیں
اور ان کے قلوب تقوی کے نور اور حضور و معیت کے استحضار سے چمکتے رہے،

قرب بے غیبت نماز عاشقاں ۔۔۔ فی صلوٰۃ دائمونم آرزوست (سید صاحب)

اور سنن نبویہ کا کامل اتباع ان کے ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت کا معمول رہا، اور کتاب و
سنت ہی کے نور سے وہ اپنے دیدہ و دل کو منور کرتے اور اپنی زندگی کو کتاب و سنت کا نمونہ
بنا کر پیش کرتے رہے،

حضرت شیخ فرماتے تھے

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں، اپنے میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہیے،
اور اس کی صورت حضور علیہ السلام کی محبت عقلی ہے جس کا مظہر اتباع احکام و سنت ہے۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارقام فرمایا،

"بے شبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے ہر امتی بقدر استعداد بہرہ ور ہوتا ہے، اور ہوتا رہیگا،
مگر اس کو منصب نبوت سے کوئی تعلق نہیں، کہ وہ بند ہو چکا،"

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے، جیسے دیئے سے دیا روشن ہو جاتا ہے صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:-

"جیسے چراغ کو چراغ جلاتا ہے، اسی طرح جن کے قلوب میلے ہو چکے ہیں وہ روشن قلوب سے جلا دیں تو صاف اور روشن ہو جائیں گے، سراجاً منیرا قرآن میں کہا گیا ہے، جو صلحاء موجود ہیں ان کے چراغ جلے ہوئے ہیں، شجرہ میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام یکجا ہیں، جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں، اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ (شجرہ میں) ملاتے ہیں، صحراؤں میں رکھے ہوئے چراغوں میں تو حرکت نہیں، اپنے اندر انوار پیدا کیجئے، دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی ہو ہمارے آپکے دل خالی ہو جائیں لیکن ابھی اللہ کے بندے موجود ہیں"۔

اندھیرا ہے عالم میں چھایا ہوا　　چراغِ جہاں قلب آگاہ ہے　(سید الملت)

ایک مرتبہ نہایت درد سے فرمایا:

"جو بھی آتا ہے یہی کہتا ہے چودہ طبق روشن ہو جائیں یہ کوئی نہیں کہتا دل روشن کر دیجئے"

سیدی و مولائی حضرت الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ ان ہی زندہ دل ہستیوں میں تھے جنھیں تقدیر الٰہی انسانوں کی اصلاح و فلاح، تربیت و تزکیہ اور دعوت و ارشاد کے نبوی فریضہ کی نیابت کے لیے چنتی ہے، اس لیے تربیت علیٰ منہاج النبوۃ سے آپ کو حصۂ وافر ملا تھا، اور روشن دل عطا ہوا تھا، جیسا کہ خود حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا ارشاد ہے

اے دلت پر نور از انوار حق　　اے دلت مسرور از اخبار حق

اے دلت معمور از اسرار حق　　اے دلت مخمور از آثار حق

اس لیے حدیث دل کے طلبگاروں کے لیے اس درویش بے گلیم کا آستانہ سکون و طمانیت کا مرجع تھا،

ایک مرتبہ فقیر نے دار منزل کے غزلکدہ میں جو آج ہزاروں سینہ فگاروں کا حریم شوق ہے عرض کیا "حضرت والا، کیا کسی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ع

نگاہ مست ساقی نے مری دنیا بدل ڈالی

فرمایا، جی ہاں، سچ ہے، میرا بھی ایک شعر ہے،

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں　　وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

پھر متبسم نگاہوں سے مجموعۂ غزلیات سے اپنا ایک دوسرا شعر نکال کر پڑھنے کو دیا،

تری نظر میں ہے تاثیر مستیٔ صہبا　　تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے　(سید الملۃ)

یہ شعر پڑھ کر ساقی کی پر معنی نگاہیں سالک کے چہرہ پر تھیں اور اسکا دل تھا کہ اڑا جاتا تھا،

شراب دیتے ہوئے اس پہ چشم ساقی تھی　　سرور مے میں کہاں سب نشہ نگاہ میں ہے

مدہوشی و سکر کا یہ عالم اس ارشاد سے ہوش سے بدل گیا،

"آپ نے شعر پڑھ لیا"

عرض کیا۔ 'جی ہاں' اور سرور دل و جان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا،

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تصوف چند اوراد و اذکار اور چند مروجہ رسوم کا نام نہیں، بلکہ توحید کے ارفع و اعلیٰ مقام کا نام تھا، دل میں عقائد حقہ کا ایسا ایقان و اذعان ہو جائے کہ قال حال بنجائے اور حب الٰہی کے سامنے غیر کی محبت ماند ہو کر خلوت خانہ محبوب حقیقی کیلیے خاص ہو جائے، احسان و تقویٰ طبعی تقاضے کی صورت اختیار کر لے، اخلاق نبوی کا پرتو ہر عمل میں جھلکنے لگے، حقوق العباد کی رعایت، معاملات کی صفائی اور معاشرت کی پاکیزگی میں ادنی کوتاہی نہ ہونے پائے، اعمال صالحہ سے رغبت اور برائیوں سے اجتناب فطرت ثانیہ بن جائے، غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریق حیات کے کامل و مکمل، ظاہری و باطنی اتباع کا نام تصوف ہے،

اندریں رہ مے تراش و مے خراش   تادم آخر دمے غافل مباش

حضرت والا تحریر فرماتے ہیں:

"بندہ ہر حال میں گنہگار ہے، اور خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور اپنی غلط کاری اور تساہل پر ندامت اور آیندہ گناہوں سے بچنے اور احکام الٰہی پر عمل کرنے پر استقامت اور ساری عمر اسی ریاضت میں گذار دینا ہی بندگی ہے۔"

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ ظاہر و باطن کے اوامر و احکام کی کامل فرماں برداری و امتثال ہی اصل طریق ہے، کتاب و سنت کے دائرے کے باہر شرعی تصوف کا کوئی وجود نہیں، اس کے خلاف جو چیز ہے وہ محض الحاد و زندقہ، بدعت و گمراہی ہے، حضرت شیخ فرماتے ہیں

لے جائیگا منزل سے بہت دور بشر کو   جو جادہ سفر کا ترے جادے کے سوا ہے (سید سلیمان)

اس لیے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مسترشدین کو اسی حقیقت کی طرف ہمیشہ متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت والا رحمہ اللہ کے مکاتیب سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں۔

۱- "تقویٰ کا خیال، حلال و حرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے، تقویٰ اصل اعمال ہے، یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ ...... لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"

۲- "تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھیے، اگر غلطی سے کبھی ہو جائے تو یاد آنے پر فوراً استغفار کیجئے، اور نیا عہد کیجئے، کہ انشاء اللہ اب اپنے قصد سے اس کا ارتکاب نہ ہوگا۔"

۳- "یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف و الہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں، قرب الٰہی صرف ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہے۔ اس لیے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے۔"

۴- "کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے، صرف حسن عمل اور کثرت ذکر کی طرف توجہ رکھیے۔"

۵- "معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہو، اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں ..... اصل میں یہی مرحلہ ہے جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے۔"

۶- "اصل نظر اپنے احوال قلب اور اعمال پر رہنی چاہیے کہ صراط مستقیم سے کسی حال میں لغزش نہ ہو۔"

۷- "نجات تو صرف فضل الٰہی کا کرشمہ ہے، عقائد و اعمال کی صحت اس کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے، بس اس میں مصروف رہنا چاہیے تاکہ اس کے فضل میں حصہ مل سکے۔"

۸- "اصل معاملہ عمل کا ہے، اس سے ترقی و تنزل کا اندازہ ہوتا ہے، معمولات اور احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز ہی اصل چیز ہے۔"

۹- "یہ سب احوال مبارک ہیں، مگر اصل شے اتباع احکام الٰہی کا اہتمام ہے۔"

۱۰- "امور خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا انسان کے اختیار میں ہیں، پس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں، اور دل سے یہ طے کرلیں کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے بڑے حکم کے خلاف نہیں کریں گے۔"

مولانا مسعود عالم ندویؒ کو مختلف مکاتیب میں اسی حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے، چنانچہ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بار بار اپنی خوشی و راحت اور اپنے کسی فعل پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کو منجانب اللہ فضل محض بلا استحقاق کرنا ہی احسان کا زینہ ہے، جس کا رسمی نام تصوف ہے، ولا مشاحۃ فی الاصطلاحات، ہم نے اب اس کا نام طریق تقویٰ رکھنا چاہا ہے، اسلام، ایمان اور احسان یا اتقاء تین ارتقائی منازل ہیں، اسلام اطاعت ہے، ایمان اس اطاعت پر سکینت اور طمانیت ہے، اور اتقا یا تقویٰ دل کی وہ کیفیت ہے، جس سے امور زیر ایمان پر عمل بسہولت

مداومت قائم ہو جائے، وللہ الحمد۔" (مکاتیب سلیمان ص ۱۷۰)

ایک دوسرے گرامی نامے میں مزید تشریح فرمائی ہے۔

"لفظ تصوف کا احسان کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے، جیسے حکمت کے ساتھ لفظ فلسفہ بول دیا جائے یا آجکل سائنس یا فلاسفی کہہ دیا جائے، بزرگوں نے لفظ احسان کو ان معنوں میں رکھا ہے اور ٹھیک ہے کہ اس کا ورود حدیثوں میں ہے، لیکن اب تو مجھے اس کے لیے تقویٰ اور اتقاء کی اصطلاح اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ورود قرآن پاک میں بکثرت ہے، اور عبادات بلکہ تمام ماموراتِ الٰہیہ کا مقصود اسی کیفیت کا حصول معلوم ہوتا ہے، واللہ یعنی ذٰلک علی من یتبع کتاب اللہ ...... معلوم ہوا کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے، اور اس کے بے شمار مدارج ہیں، مدارج قرب و اقربیت کما لا یخفی جس طرح ایمان کا حصول شہادت پر مبنی ہے، احسان کا قرب کمال ایمان و تقویٰ پر ہے۔۔ ...... الغرض ہمارے علماء ظاہر نے صرف اس ایمان پر توجہ فرمائی ہے جو کفر کے بالمقابل ہے، اور علماء باطن نے اس کے بعد کی منزل کی رہبری کی، اور درجات و مدارج قرب کی نشاندہی فرمائی"

"...... طلب رضا اور اپنے ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا ہی اس طریق کا حاصل ہے" اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو نسبت کہتے ہیں، اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبھم ویحبونہ اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ میں کی گئی ہے، یا ایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ان ہی کے لیے نوید بشارت ہے۔" (ص ۱۴۸-۱۷۶، مکاتیب سلیمانی)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ سلوک طریق حصول احسان و تقویٰ کا نام ہے، جس کا اصلی مقصد رضائے الٰہی ہے، اور یہ احسان و تقویٰ اور رضائے الٰہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل و مکمل ظاہری و باطنی اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے،

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"غیر ماثور طریقے ہرگز اختیار نہ کریں" (مکاتیب سلیمان ص ۱۷۶)

اپنے نعتیہ اشعار میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت — جو پیروِ احمد ہے وہ محبوبِ خدا ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوبِ نبی کی — محبوب خدا ہے وہ جو محبوبِ نبی ہے

سنتِ بیضا راہ تری، جاہ خدا کی جاہ تری — شافع عاصی جاہ تری عرش پہ مسند علےٰ علیٰ

لولاک لما عنوان ترا، فرمان خدا فرمان ترا — پیغام خدا پیغام ترا، ایمان خدا ایمان ترا

تیری محبت دین مرا اور دین ترا آئین مرا — ہر لفظ پہ تیرے یقین مرا عرفان خدا عرفان ترا

ایک دوسرے گرامی نامے میں ارشاد ہوتا ہے

"باقی ترکیبات و بدعیات تو ان کا ذکر ہی کیا، لیکن جس طرح مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام پر آج حکم نہیں لگایا جا سکتا، ایسے ہی بازاری دکاندار رنگے ہوئے صوفیوں کو دیکھ کر تصوف کو بدنام نہ کیجیے" (مکاتیب سلیمان ص ۱۶۶-۱۶۷)

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان تمام غیر شرعی عقائد و اعمال کو ناجائز، اور ان رسومات و قیود، فلسفیانہ تعبیرات و خیالات کو جو کہ بیرونی اثرات کی بنا پر تصوف میں داخل ہو گئے ہیں، سخت ناپسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے مزاحاً ارشاد فرمایا: "آپ کو فقیری کا ایک آسان نسخہ بتا دوں" میں نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا" دو پیسے کا گیروا رنگ لے لیجیے، اور ان سے اپنے کپڑوں کو رنگ لیجیے، اور اگر ایک ٹیڑھا سا ڈنڈا مل جائے تو اور بھی اچھا ہے، اور ہو حق کرنی شروع کر دیجیے، ہو گئی فقیری!...... پھر نہایت دردسے فرمایا" جاہل اور بازاری صوفیوں نے تصوف کا ناس کر دیا"، ایک مرتبہ لطائف ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا" تصوف جو سراسر عمل تھا اسے فلسفہ بنا دیا، اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا"، فرماتے تھے" اس وقت دنیا میں تین قسم

تصوف ہے، ایک ملحدانہ تصوف، دوسرا عامیانہ یا بازاری تصوف، تیسرا صحیح اور اسلامی تصوف اور وہی حق ہے۔"

ملحدانہ تصوف، حکمائے کی فلسفیانہ موشگافیوں، نو افلاطینیت اور یوگ اور ویدانت سے متاثر ہوکر الحاد و زندقہ اور وحدۃ الوجود وغیرہ کی غلط تعبیرات سے صریح شرک اور عملی تعطل بن گیا، جاہل صوفیا نے تصوف کی غلط تعبیرات کا ایسا صور پھونکا کہ اس کی تاریکی میں اصل تصوف کا نور گم ہوکر رہ گیا، احکام کی کامل پابندی، سنن نبوی کا اتباع، فضائل اخلاق کا حصول، رذائل کا ترک، اخلاص و عبدیت اور احسان و تقویٰ کی تحصیل، قرب و رضائے الٰہی کی لگن، توحید و یقین اور محبت و خشیت الٰہی کی طلب، حضور و ذکر دوام کی رُح جو تصوف کے اصل عناصر تھے، نگاہوں سے اوجھل ہوکر رہ گئے، اور عوام کی اعجوبہ پرستی اور متصوفین کی بے راہ روی نے کشف و کرامات، الہام و وجدانیات ہی کو اصل تصوف اور سلوک کا مقصد قرار دیدیا، حالانکہ ان چیزوں کو مقاصد تصوف میں کوئی دخل نہیں، یہ صرف انفعالات اور مجاہدات کے ثمرات عاجلہ اور محض راہ کے تماشے ہیں، جو اگر کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو محمود ہیں لیکن مقصود نہیں کہ اصل مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے، جو صرف عقائد حقہ اور ایمان صالحہ کا نتیجہ ہے، اور ان اشیاء (کشف و کرامات وغیرہ) کو رضا اور قرب الٰہی میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں مانع طریق اور تنزل کا سبب بنجاتی ہیں، کیونکہ سالک ان "بزرگانہ اوہام" "روحانی حجابات" اور "پاکیزہ شعبدوں" میں اس طرح الجھ کر رہ جاتا ہے کہ اصل مقصد بلکہ راستے ہی کو گم کر دیتا ہے، اور تمام عمر ان ہی شعبدہ بازیوں میں سرگرداں اور ان کو حق کا نشان اور رضائے الٰہی کا ثمرہ و انعام سمجھ کر گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے،

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

حضرت سیدی قدس سرہٗ اپنے متعلقین کو ہمیشہ اس حقیقت سے آگاہ و متنبہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

۱۔ "کیفیات آتی جاتی ہیں، کشف و الہام کو قرب میں کوئی دخل نہیں"

۲۔ "یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف و الہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں، قرب الٰہی صرف ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہیں، اس لیے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے۔"

ایک طالب نے لکھا تھا کہ "نماز میں اسرار وغیرہ منکشف کر دیئے جاتے ہیں اور واردات صحیحہ کا بعض اوقات بہت زیادہ نزول ہوتا ہے۔" اس کے جواب میں سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عتاباً تحریر فرمایا:

"نماز کشفِ اسرار اور وارداتِ صحیحہ کا محل نہیں، یہ صرف عبودیت و عبدیت و تواضع و حضور کی کیفیت کا محل ہے، آپ ان شعبدوں کی طرف التفات نہ کریں، یہ امور قرب الٰہی میں کچھ دخل نہیں رکھتے، اور نہ اس سے حصولِ ثواب ہوتا ہے، کیا ریل میں راستہ کے مناظر پر نظر منزلِ مقصود کو قریب کر دیتا ہے؟ کیا یہ خیال حماقت نہیں۔"

کسی طالب نے تحریر کیا "الحمد للہ کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہیں رہی، بلکہ ابتدا میں کشف وغیرہ کا جو عموم تھا اب نہیں ہے، اور نہ ہی اس کی طرف رغبت ہے۔" اس کے جواب میں حضرت شیخؒ نے ارقام فرمایا:

"بحمد اللہ تعالیٰ کہ آپ نے اس گھاٹی کو پار کر لیا۔" اسی طالب کو ایک دوسرے کرمت نامے میں تحریر فرمایا ہے:-

"اب جو یہ صورتِ حال تواضع اور افتادگی کی پائی جاتی ہے، اس حال سے بہتر ہے جو آپ کی کشف و واردات کی تھی، وہ راہ خطرناک تھی کہ اس میں کبر و غرور کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مانع ترقی ہے۔"

مندرجۂ بالا مباحث سے یہ چیز واضح ہوگئی ہے کہ حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سلوک صرف چند اوراد و اشغال اور احوال باطنی کا نام نہیں، بلکہ پوری زندگی کو سدھارنے، طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بنانے اور کمال تقویٰ و احسان کے حصول کی کوشش کا نام ہے، جس میں کشف وکرامات وغیرہ کو کوئی دخل نہیں، اس لیے ظاہری بد اعمالیوں اور فسق و فجور اور احکام الٰہی اور سنت نبویؐ کی خلاف ورزی کے ساتھ باطن کی اصلاح، قلب کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور دل کی نورانیت کا گمان ایک واہمہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اور ایسے لوگوں سے اگر کسی خرق عادت چیز کا ظہور بھی ہو جائے تو نری شعبدہ بازی، استدراج و امہال ہے، جو کبھی بھی مقبولیت الٰہی اور قرب خداوندی کا نشان نہیں ہو سکتا، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

شعلے اٹھیں ہزار، تجلی مگر کہاں — یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں

اس بنا پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ظاہری اعمال کی اصلاح، اخلاق کی پاکیزگی، معاملات کی صفائی اور معاشرت کی درستگی اور حلال و حرام کی تمیز کو تصوف کا سب سے بڑا مقصد اور سالکین کے لیے ضروری سمجھتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ

"حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دور میں اوراد و وظائف اور اشغال کی تعلیم سے پہلے اخلاق و معاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ فرماتے تھے، اس سے مقصود یہ تھا کہ سالک کو اوراد و وظائف میں مشغول کرنے سے پہلے اخلاق و معاملات کی صفائی کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس کیجانب توجہ کم کی جاتی ہے، بسا اوقات ذکر کی برکت سے طالب کے قلب پر انوار و واردات کا نزول ہو جاتا ہے جس کی بنا پر وہ اسی کو مقصد سمجھ لیتا ہے، اور اسی کو بزرگی سمجھ کر اصلاح اعمال اور درستگی اخلاق و معاملات سے غافل ہو جاتا ہے، اس طرح نہ صرف اسکی ترقی رک جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت الشیخ رحمہ اللہ

سالکین کی تربیت میں اس چیز کا خاص اہتمام فرماتے تھے کہ وہ دین کے تمام شعبوں کی اصلاح اور جملہ اوامر (ظاہری و باطنی) کی پابندی کو اپنا شیوہ بنائیں، اور ایک کو مقصد سمجھ کر باقی سے اغماض نہ برتیں آپ کا پہلا گرامی نامہ جو ایک طالب صدیقی غلام صابر صاحب کے نام ہے، جس سے اس اصول پر روشنی پڑتی ہے نقل کیا جاتا ہے:

"مکرم و محترم حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ فقیر نے آپ کا خط پڑھا، حالات معلوم ہوئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے، کہ آپ کو صحیح ہدایت نصیب ہوئی، کبھی مصیبتیں بھی ہدایت کا باعث ہوتی ہیں، آپ حضرت مولانا تھانوی رح کی کتابوں میں سے پہلے قصد السبیل پھر تعلیم الدین پڑھیے، اور حضرت کے جس قدر مواعظ و ملفوظات مل سکیں مطالعہ کرتے رہیں، اور استغفار کی کثرت کریں، اور نماز پنجگانہ با جماعت کا اہتمام کریں، اور معاملات میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کریں، اور اچھے اخلاق اختیار کریں، اور برے اخلاق سے پرہیز کریں، اگر آپ کا جی چاہے، تو مجھ سے خط و کتابت جاری رکھیں، اور اپنے احوال سے مطلع کرتے رہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مرضیات پر چلائے۔"

سید سلیمان

ایک دوسرے طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"تقویٰ کا خیال، حلال و حرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے، تقویٰ حاصل اعمال ہے، یا ایھا الناس اعبدوا ربکم ...... لعلکم تتقون۔"

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے، اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں......"

دوسرے مکتوب میں اسی طالب کو لکھا، "جی ہاں یہی مرحلہ ہے، جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے،

اس کے لیے ضرورت ہے کہ رسالہ صفائی معاملات پڑھیں"۔

ایک مرتبہ راقم چند سیاسی ساتھیوں کے ہمراہ پشاور سے کراچی کے سفر کے لیے روانہ ہوا، خوش قسمتی سے لاہور کے اسٹیشن سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت کراچی تک نصیب ہوگئی، سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ تھا، باقی رفقائے سفر بھی اپنے ہی ساتھی تھے، لاہور سے گاڑی روانہ ہوئی تو ایک سیٹ پر میں اور حضرت سیدی قدس سرہٗ بیٹھ گئے، حضرت والاؒ کی طبیعت نہایت مضمحل تھی، اور نیند کے غلبہ کی بنا پر گردن مبارک بار بار ادھر اُدھر جھک جاتی تھی، میں نے یہ دیکھ کر پیچھے تکیہ رکھنے کی کوشش کی، لیکن عجیب دلبرانہ تبسم کے ساتھ انکار فرمادیا، کچھ دیر کے بعد حضرت والاؒ کے اضمحلال، ضعف اور نیند کے غلبہ کو دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی نے عرض کیا "حضرت آپ لیٹ جائیں، اور آرام فرماویں، اشرف صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں گے"، حضرت والا نے اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے فرمایا "گاڑی میں بارہ گھنٹہ کا جلسہ ضروری ہوتا ہے"۔ مراد یہ تھی کہ ریلوے کے قوانین کے مطابق دن کے اوقات میں بیٹھنے کی جگہ سے زیادہ جگہ لیٹنے کے لیے استعمال نہیں کرنی چاہیے، اس بنا پر لیٹنے سے معذوری ہے، تقویٰ اور صفائی معاملات کی ایسی نظیریں کہاں ملتی ہیں، اسی سفر میں راقم نے چائے منگوائی، اور حضرت والاؒ نے بھی میرے ساتھ نوش فرمائی، چائے پینے کے بعد بل پوچھا، فقیر نے بلطائف الحیل ٹال دیا، کراچی اترنے سے پیشتر پھر ارشاد فرمایا "آپ نے بل نہیں بتایا" عرض کیا "حضرت میں ادا کرچکا ہوں، کوئی بڑی رقم نہیں"۔ فرمایا "کیا معلوم آپکے حالات اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں"۔ حضرت والاؒ کے اصرار پر مجبوراً رقم بتانی پڑی، جو اسی وقت ناکارہ کو عطا فرمادی۔

ایک مرتبہ دارمنزل میں حاضری ہوئی، دوران ملاقات میں ایک مستعمل ٹکٹ جس پر مہر کا کوئی نشان نہیں تھا، اور دوبارہ استعمال کیا جاسکتا تھا، بندہ کو دکھا کر استفسار فرمایا، کیا اس کو دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟ عرض کیا تقویٰ کے خلاف ہے"۔ فرمایا "تقویٰ کے تو خلاف ہے، فتوی کیا ہے"؟

عرض کیا آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا "ناجائز ہے" اور اسے چاک فرمادیا،

ایک سفر میں ملتان اتر کر مدرسہ خیر المدارس تشریف لے گئے، خادم ساتھ تھا، چہرہ مبارک راستے کے گرد وغبار سے اٹا ہوا تھا، اس لیے وضو کے وقت صابن کا استعمال فرمایا، احقر نے دوران وضو میں لوٹا لیکر پانی ڈالنا چاہا، حضرت والاؒ نے یہ کہکر انکار فرمادیا کہ "آپ کو نیت کا سوال تو حل ہی گیا، دوسرے وضو کرانے میں پانی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ جو مستحسن نہیں"۔

لائلپور کے ایک سفر کی واپسی میں (جس میں خاکسار کو خدمت کی سعادت نصیب ہوئی تھی) حضرت والا کے بستر میں سے ایک روپیہ نکلا، میں پشاور جاچکا تھا، خط میں استفسار فرمایا "یہاں واپسی میں میرے بستر سے ایک روپیہ نکلا، میرا نہیں ہے، معلوم نہیں کس کا ہے، آپ کا تو نہیں"؟ میں نے جواباً لکھا کہ میرا نہیں اور ایک دو رفقائے سفر کے نام لکھ دیے کہ ان سے پوچھ لیا جائے، تحریر فرمایا "ان میں سے کسی نے اپنا ہونا نہیں بتایا، میں نے پوچھا تھا"۔ اسی طرح ایک دوسرے پشاوری طالب کا فونٹین پن حضرت شیخ قدس سرہٗ کے مکان پر رہ گیا اور وہ پشاور آگئے، حضرت والا نے راقم کو تحریر فرمایا کہ مرتضیٰ صاحب کو سلام کے بعد کہہ دیں کہ ان کا فونٹین پن یہاں چھوٹ گیا ہے، اگر ان کا ہے تو اس کے بھیجنے کی تدبیر بتائیں"۔

ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں آپکے استعمال کی تمباکو الائچی دانہ پیش کی، شیشی کے لیبل پر تصویر تھی، حضرت والاؒ نے اس کاغذ کی تصویر کا گردن سے اوپر کا حصہ اڑا دیا، جو انتہائی احتیاط کی دلیل ہے،

گو بظاہر یہ واقعات معمولی معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان ہی سے تقویٰ کے اتباع کا اندازہ ہوتا ہے،

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ مسترشدین کو کسب حلال کی اکثر تلقین فرماتے تھے، جس سے اس رسمی توکل کی تردید ہوجاتی ہے جو لوگوں کو اپاہج اور ناکارہ بنا دیتا ہے، اس کے متعلق بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

"تعلیم اور طلب رزق کے اسباب میں سستی نہ کیجئے کہ اس پر نفس کا اطمینان موقوف ہے جس کی بہت ضرورت ہے"

ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ "طلب رزق کے اسباب میں کوشش اور مشورہ طلبی توکل کے منافی تو نہیں"،

ارقام فرمایا: "ہرگز منافی نہیں، طلب رزق حلال بندہ پر واجب ہے، اس کی تدبیر اختیار کرنا بھی واجب، مگر نظر

اللہ تعالیٰ پر رہے کہ وہی رزاق ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں: "طلب رزق حلال از جملہ فرائض و واجبات ہے، اس سے تو

کسی حال میں تغافل درست نہیں، اللہ تعالیٰ مدد فرماویں اور غیب سے سامان فرماویں۔"

ایک طالب کو تلقین ہوتی ہے: "بے شبہ معاشی پریشانیاں بڑی آزمائش ہیں اس کے لیے جو تدبیر سمجھ میں آئے

کیجائے برکت دینے والے اللہ ہیں، هو الرزاق ذو القوۃ المتین۔"

اسی طالب کو دوسرے مکتوب میں ہدایت ہے: "معاشی پریشانیوں کا علاج دعا اور تدبیر دونوں سے کرنا چاہیے۔"

راقم کو تحریر فرمایا: "تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں کہ یہ حصول رزق کی کوشش ہے، اس نسبت سے یہ تعلیمی

جد و جہد بھی عبادت ہی میں شمار ہوگی، بایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر کو قائم رکھیں۔"

دوسرے طالبوں کے مختلف خطوط میں بھی اسی طرح کی ہدایات پائی جاتی ہیں،

"دنیاوی پریشانیاں اگر علاج پذیر ہیں تو تدبیر سے کام لیجئے، اور اگر علاج سے باہر ہیں تو حوالہ خدا کیجئے،

کہ جو ہمارے حق میں مفید ہوگا وہ فرمائیں گے۔"

"رزق حلال کی کوشش بھی دین کے اجزاء میں سے ہے، نیت درست ہو تو یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔"

"طلب کسب حلال فرض ہے، جب دیگر ذرائع کامیاب نہیں تو ملازمت میں کیا حرج ہے، اگر وہ کسی

شرعی وجہ سے ناجائز نہیں، آپ دعا اور تدبیر میں لگے رہیں، جب صورت اچھی نکل آئے تو تجارت شروع کر دیں۔"

ان اقتباسات سے "سلوک سلیمانی" میں رزق حلال کی طلب اور معاشی تگ و دو کی اہمیت

کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

"سلوک سلیمانی" میں دعوت و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کے علاوہ سیاسیات کی تربیت بھی داخل تھی،

اور سالکین کو کبھی کبھی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کی تلقین بھی فرماتے تھے جس کا خانقاہی زندگی میں عموماً گذر

نہیں، گو جہاد بالنفس، جہاد بالسیف اور قتال فی سبیل اللہ سے کم نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مکی زندگی

ہی کا جہاد بالنفس جس طرح مدنی زندگی کی سرفروشانہ اور عسکرانہ زندگی کی تربیت گاہ تھا، اسی طرح صحیح خانقاہی

زندگی انسان میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی جلالی و جمالی شان کے مظاہر بدر و حرا اور حنین و شعب ابی طالب دونوں ہیں، صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کی خصوصی صفت یہی تھی کہ وہ رات کو عابد شب زندہ دار اور دن کو میدان جنگ کے شہسوار

تھے، کامل اسلامی زندگی کی یہ جلالی (عسکریت) اور جمالی (سلوک و تصوف) شانیں ہم نے اسی مرد حق آگاہ

میں پائیں، حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے سلوک کی یہ دوگونہ دلکشی اسی ذات جمیل و جلیل صلی اللہ علیہ وسلم

کا فیض تھا، جو اس عالم میں جلالی و جمالی صفات الٰہیہ کا برزخ کامل تھا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دار نذیری

متعدد بار حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو تلقین و ترغیب کے طور پر اپنے مخصوص انداز میں

فرمایا "آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں"۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۳ء کو یوم پاکستان کے سلسلہ میں ہوائی مظاہرہ

اور فوج کی پریڈ تھی، اس سے پہلی رات مجھ سے استفسار فرمایا، کیا آپ مظاہرہ دیکھنے جائیں گے؟

میں نے نفی میں جواب دیا تو ارشاد فرمایا "آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں"۔ ایک دوسرے طالب کے

انکار پر فرمایا، آپ صرف خانقاہی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا،

"ان فوجوں کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے، کم از کم انھیں اپنی فوجیں تو کہہ سکتے ہیں"۔ ان ارشادات سے

حضرت کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، جو عصری سلوک میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔

اسی طرح سیاسیات کے متعلق بھی سالکین کے لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص نظریہ تھا،

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ عصری سیاست کو خالص اسلامی سیاست نہیں سمجھتے تھے اور اس میں انہماک مناسب نہیں جانتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ پاکستان کے ایک مشہور پیر کے متعلق فرمایا، پیر... صاحب کو اب کس طرح ادھر (خالص دین کی خدمت کی طرف) لایا جائے، وہ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سب کچھ سیاست ہی ہے، مذہب کچھ نہیں، منہ کو خون لگ گیا ہے۔ چنانچہ ہے "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی"

ایک طالب نے سوال کیا موجودہ سیاست کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا "کہاں کی سیاست، اصل کام تو مسلمان بننا اور بنانا ہے"، فرمایا کرتے تھے "اسلامی سیاست دعوت کے بعد پیدا ہوتی ہے"، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دعوت میں سیاست خود بخود آجاتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فائنینس کے وزیر اور سیاسی قوتیں جمع نہیں کیں، نہ یہ کہا کہ آؤ ملکر حکومت کریں، صرف کلمہ کی طرف لوگوں کو بلایا، دین کی دعوت دی، سیاست ذیل میں خود بخود آگئی، گو اسلام میں سیاست اور دعوت علیحدہ نہیں ہے، لیکن سیاست کے منافع اور ضرر سے دعوت پر بھی اثر پڑتا ہے، اور بسا اوقات سیاست کی وجہ سے دعوت کو نقصان پہنچ جاتا ہے ......"

راقم کی ایک سیاسی ناکامی پر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا"، اور ایک دوسرے موقع پر ایک صاحب سے میری اس ناکامی کا تذکرہ کرکے فرمایا "سیاست کا کچھ تجربہ انھیں ہوا ہے، اب سمجھے ہیں کہ یہ کونین کی طرح کڑوی گولی ہے"، اور اسی کے متعلق مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا "الخیر فی ما وقع۔ بہرحال آپ کو سیاسیات کا تھوڑا سا تجربہ ہو گیا"۔ اپنے سیاسی انہماک کی وجہ سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی تو سیاسی باتیں اکثر چھیڑ دیتا، ایک مرتبہ ندامت کے طور پر عرض کیا، حضرت آپ کی مجلس کے آداب بجا نہیں لاتا، اور سیاسی بکواس شروع کر دیتا ہوں، فرمایا "کیا حرج ہے، انسان وہی اگلتا ہے جو اندر ہوتا ہے، اچھا صاف ہو جائے گا"، خدا کی شان حضرت کے اس ارشاد کے بعد روز بروز سیاسی جھمیلوں سے بیزاری اور عملی سیاست سے کنارہ کشی

کا میلان بڑھتا رہا یہاں تک کہ تعلیمی خدمت میں مشغول ہو رہ گیا، جب حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع دی گئی تو ارقام فرمایا "جماعتی کاموں میں اتنی کثیف گندگی ہے کہ اس کا ازالہ ہم ضعفا سے ممکن نہیں"۔ تاہم حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے آخر وقت تک سیاست کے چھوڑنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ میری آخری حاضری کے ایام میں ایک مرتبہ جب سیاسی خرابیوں کا تذکرہ چھڑا اور ایک دوسرے صاحب نے راقم سے کہا، آپ اس گندی سیاست کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ حضرت والا نے اس موقع پر فرمایا "یہ معاملہ ہر ایک کی اپنی قوت وضعف اور نیت کا ہے"، ایک مرتبہ راقم نے تحریر کیا کہ "موجودہ سیاست کے ساتھ چلنا اور انھیں صحیح بنیادوں پر اٹھانا نہایت ہی دشوار کام ہے، قدم قدم پر پاؤں ڈگمگاتے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرما دیں"، اس کے جواب میں ارقام فرمایا:

'تو پاک باش مدار از کس باک'

ایک مرتبہ راقم بغیر اپنی کوشش کے ایک اہم سیاسی جماعت کا عہدہ دار بنا دیا گیا، حضرت کو مطلع کیا تحریر فرمایا "اللہ تعالیٰ اس کی قوت آپ کو عطا کریں، جب واقعہ ہو چکا تو مشورہ دینے کا موقع نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر کریں"۔

رفقاء کے پیہم دباؤ کی بنا پر عاجز نے سرحد اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہونے کا مشورہ طلب کیا، تو نہایت ہی بلیغ جواب تحریر فرمایا

"یہ معاملہ اپنی قوت وضعف کا ہے، اگر آپ یہ قوت اپنے میں پاتے ہیں یا کم از کم ارادہ رکھتے ہیں کہ مواقع خیر میں خیر کی اعانت کریں گے تو کھڑے ہو جائیں، مگر انتخاب کے لیے وہ مکائد و دسائس کام میں نہ لائیں جو اہل دنیا اور طالب جاہ و مال کرتے ہیں، پس جاہ و مال کی طلب سے خالی ہو کر کرنے کی طاقت پائیں تو کھڑے ہوں"۔

ایک مرتبہ چند شامی نوجوان خدمت میں حاضر ہوئے، اور نظام اسلامی اور شریعت کے نفاذ پر بات چیت ہوئی، ان کے رخصت ہونے پر حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فقیر سے فرمایا:

"آج ہر جگہ نوجوانوں میں دینی احیا اور شریعت کے نافذ کرنے کا جذبہ ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ سٹیرنگ دوسروں کے ہاتھ میں ہے"۔

مذکورہ بالا ارشادات سے سیاست کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے کہ سیاست کو مقصد سمجھ کر اس میں انہماک کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اگر سیاست کو دین و خیر کے فروغ کا سبب و ذریعہ سمجھکر کمال احتیاط سے اپنے کو حب مال وجاہ کی آلائشوں سے بچاتے ہوئے اس میں شرکت کیجائے تو مسلک سلیمانی میں اس کی گنجائش ہے، لیکن یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اور حضرت شیخؒ ہی کے الفاظ میں "جماعتی کاموں میں اتنی کثیف گندگی ہے کہ اس کا ازالہ ہم ضعفاء سے ممکن نہیں، تاہم ہر ایک کی اپنی قوت وضعف اور نیت کا معاملہ ہے"۔

(باقی)

سلیمان نمبر

(مرتبہ شاہ معین الدین ندوی)

معارف کا سلیمان نمبر جسکا شائقین و قدردان معارف کو مدت سے انتظار تھا، مئی میں شائع ہو گیا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور انکے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اس کے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو ۲ میں اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے چار روپے میں دیا جاتا ہے، صرف ۱۵ سو چھپا تھا، تھوڑے نسخے اور رہ گئے ہیں، جلدی کیجئے۔

منیجر

حکیم فغفور لاہجانی

از جناب سید اختر مسعود صاحب رضوی لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

جن تابناک ستاروں نے عہد جہانگیر کے آسمان شاعری کو سجایا تھا، ان میں ایک فغفور بھی تھا، اس شیریں بیان شاعر کے دیوان کا سراغ نہیں ملا لیکن فارسی شعراء کے اہم تذکروں میں اس کے حالات زندگی، اور اشعار کے نمونے ملتے ہیں، اس مضمون میں ان تذکروں کی مدد سے فغفور کی زندگی کا ایک خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے، اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

فغفور کا نام محمد حسین اور باپ کا نام سید احمد تھا، جو گیلان کے حاکم احمد خاں کے مقربوں میں سے تھا، فغفور لاہجان میں پیدا ہوا، اور باپ کی وفات کے بعد ایران کی سیاحت کرتا رہا[1]، تذکرہ عرفات العاشقین[2] کے مؤلف سے غالباً اسی دوران میں فغفور کی ملاقات اصفہان میں ہوئی،

"قبل از آنکہ بہ ہند آید ویرا در صفاہان بہ صحبت رسیدہ ام .... سالے از آں پیشتر بعرصۂ ہند قدم نہادہ ......"

فغفور گھومتا پھرتا آذربائیجان پہنچا اور وہاں سے گرجستان چلا گیا، کچھ عرصہ گرجستان کے حاکم کی خدمت میں بسر کیا، لیکن فغفور کو گرجیوں کے مذہبی عقائد پسند نہ تھے، اس لیے موقع پا کر عراق چلا گیا، یہاں فغفور کی ملاقات حکیم شفائی سے ہو گئی، اس ملاقات میں دو نوک جھونک دلچسپ چوٹیں رہیں، جس کا ذکر میخانہ میں اس طرح درج ہے:

---

[1] میخانہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۲ [2] قلمی نسخہ کتب خانہ بانکی پور، ص ۵۱۱ الف

"...... اول شفائی متکلم شد واز فغفور باین عبارت کم وبیش پرسید که نیرمن توکجائی؟

فغفور جواب داد کہ گیلک، آن ہزال بے عدیل فی الحال بدو گفت کہ گیلک وکودن بحساب جمل

در عدد باہم مطابق یکدیگراند۔ فغفور بے اندیشہ وتامل گفت وبلے ہم چنان کہ صاحب جمل مرکب

وشفائی بہمان حساب باہم موافق وبرابراند"[1]

شفائی لاجواب ہوگیا اور پھر کبھی اس طرح کی بات نہیں کہی، اس کی خبر ایران کے فرماں روا شاہ عباس صفوی تک پہنچی تو اس نے فغفور کو بلایا اور اس سے گفتگو کی، اس کے بعد فغفور نے شاہ عباس کی شان میں قصیدے کہے اور صلے پائے، لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے حکمراں جہانگیر کی فیاضی اور علمی قدردانی کا دریا اس زور سے بہہ رہا تھا کہ ممتاز شعراء کے کہیں اور قدم نہ جمتے تھے، چنانچہ فغفور نے بھی ہندوستان کا رخ کیا، راستے میں قندھار پڑا، جہاں اس زمانے میں مرزا غازی بیگ ترخان جہانگیر کی طرف سے حاکم تھا، جو علم و شعر کی سرپرستی میں یگانۂ روزگار تھا[2]، اس نے فغفور کو بڑی قدردانی سے اپنے پاس بلایا اور اس سے مہربانی سے پیش آیا، لیکن اس کے دو درباری شعراء مرشد بروجردی اور مولانا اسد قصہ خواں نے فغفور کو پریشان کرنا شروع کیا اور رشک و حسد میں اس کے کلام پر بیجا اعتراضات کرنا شروع کر دیے، حاسدوں کے اس رویے سے فغفور آزردہ خاطر ہوا، اور ایک روز کسی کو اطلاع کیے بغیر قندھار چھوڑ کر لاہور روانہ ہوگیا، مرزا غازی کو تین دن بعد یہ خبر ملی تو اس کو بڑا صدمہ ہوا، اور اس نے اسد اور مرشد کو مخاطب کرکے کہا کہ

"شما بہ شومی حقد جبلی خود مارا رسوا کردید، من در عالم مردم شناسی بسیار دور از کار می دانم کہ مثل فغفور کسے در ایام حکومت من برسد وبے آنکہ فیضے ببیند مفارقت گزیند"[3]

اور فغفور کو ایک خط لکھا جس میں اپنی برأت کا ذکر کرکے اس کو واپس بلایا، اور اسد اور مرشد کو حکم دیا

[1] میخانہ ص ۲۳۳، ۲۳۴ [2] دیکھیے میرا مضمون معارف نومبر و دسمبر ۱۹۵۲ء [3] میخانہ ص ۲۳۳، ۲۳۴

کہا کہ تم دونوں نے اس کو دکھ پہنچایا ہے، اس لیے تم لوگ معذرت نامے لکھو اور اس کو واپس بلاؤ، انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور فغفور کو لکھا، اگر آپ واپس آجائیں تو ہم اپنی خطاؤں کی معافی مانگ لیں اور آپ کے لیے انعامات منظور کرائیں، یہ سب تحریریں اس کو راستے میں ملیں، لیکن اس کی خودداری کو بڑی ٹھیس لگ چکی تھی، اس لیے وہ قندھار واپس جانے پر تیار نہیں ہوا، اور جواب میں یہ رباعی فی البدیہہ لکھ کر بھیجدی

ان جیفہ کہ در جنگ دو کرگس باشد — حیف است کہ لوثِ دامن کس باشد

خرد اطلب شاخ زیادت طلبی است — بایک سر خر دو گوشِ خر بس باشد[1]

فغفور کی یہ رباعی شاعرانہ حیثیت سے کتنی بلند پایہ کیوں نہ ہو لیکن مرزا غازی سے کوئی ایسی سنگین غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی کہ اس کو "جیفہ" اور "خر" سے مخاطب کرکے دشنام طرازی کی جائے۔

فغفور قندھار سے لاہور پہنچا، شہر کی سیر کرکے آگرہ گیا، جو اس کی منزل مقصود تھی، حکومت مغلیہ کے امرا اپنے بادشاہ کی طرح علماء اور شعراء کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کرتے تھے، اور ان کو اپنا مہمان بنا کر عزت کے ساتھ رکھتے تھے، آگرہ میں فغفور حکیم علی گیلانی کے ساتھ کچھ دن مقیم رہا، اس کو یہ امید تھی کہ حکیم علی کی سعی و سفارش سے اس کی رسائی شاہی دربار تک ہو جائے گی، لیکن اس کی ٹال مٹول سے فغفور بددل اور ناامید ہوگیا اور جب اس کو جہانگیر کا درباری شاعر بننے کی آس نہ رہی تو اس نے کسی شہزادہ کا دامن عاطفت پکڑنے کی کوشش کی اور برہانپور جاکر شہزادہ پرویز کی ملازمت اختیار کرلی[2]، مخزن الغرائب[3] میں ہے کہ وہ پرویز کا ملازم طبیب کی حیثیت سے ہوا تھا، لیکن دوسرے تذکروں میں اس کا ذکر نہیں کہ فغفور کسی حیثیت سے بھی فغفور کے ملازمین کے زمرے میں داخل ہوا ہو، فغفور نے اس کی مدح میں قصائد لکھے، انعام حاصل کیے، شاہزادہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا اور بڑی عزت کرتا تھا، فغفور

[1] مے خانہ ص ۲۴۴-۲۴۵ [2] سب تذکرے متفق ہیں [3] قلمی بانکی پور کتب خانہ ص ۴۴

شاعری کے علاوہ موسیقی، طب، خطاطی، شطرنج بازی اور علم ہندسہ میں بھی دخل رکھتا تھا، تمام تذکرے متفق ہیں کہ فغفور پہلے رسمی تخلص کرتا تھا، بعد میں فغفور اختیار کیا، لیکن صاحب مخزن الغرائب نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے فغفور کی موسیقی دانی کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی یہ تبدیلی کس موقع پر ہوئی، اس کا بیان ہے کہ

"اول در ایران رسمی تخلص می کردہ بعد ازان فغفور تخلص نمودہ، سبب آنکہ روزے در مجلس شہزادہ خرمی ور نشستہ بود کہ کاسہ نوازے بہ تیز دستی تمام مجلس را محظوظ کردہ بود مگر شہزادہ چنداں از و خوش نہ گردید چراکہ او در چینی نوازی ناقص بودہ، شہزادہ رو بہ حکیم کرد و گفت شنیدہ ام کہ در ایران چینی نواز خوب بہم می رسد، گفت اگر ادب مانع نباشد بندہ دریں کار ہم دستے دارد، فرمود بسم اللہ ازیں چہ بہتر، حکیم بہ طریقے کاسہ نواخت کہ شہزادہ فتنہ او گشت و او را فغفور خطاب بخشید، بداں جہت وے تخلص فغفور قرار دادہ"

جہانگیر کے فرمان[1] کے مطابق جب پرویز دکن سے الہ آباد روانہ ہوا تو فغفور اس کے ہمراہ تھا، اسکا ہم عصر تذکرہ نگار صاحب عرفات العاشقین لکھتا ہے:

"...... ہزار و بیست و پنج کہ بندہ در اجمیر بودم، وے در خدمت شہزادہ پرویز الہ آباد رفتہ اند ......"[2]

تذکرہ میخانہ[3] سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ فغفور شہزادے کے ساتھ دکن سے الہ آباد آیا، ۱۰۲۸ھ میں پرویز کے بڑے لڑکے کا انتقال ہوگیا[4]، اس موقع پر فغفور نے ایک پر درد مرثیہ کہا[5]، اگرچہ فغفور طبیب کی حیثیت سے پرویز کا ملازم ہوا تھا لیکن شعر و سخن کا مشغلہ جاری تھا، طاہر نصیرآبادی

[1] تزک جہانگیری جشن یازدہمین نوروز، جمادی الاولی ۱۰۲۵ھ [2] قلمی، کتب خانہ بانکی پور ص ۱۷۱ الف [3] ص ۲۳۵
[4] تزک جہانگیری جشن چہاردہمین نوروز [5] مخزن الغرائب، قلمی، بانکی پور، ص ۴۴۶ ع ۱۰ ایضاً

اپنے تذکرے[1] میں لکھتا ہے:

"با ملا نادم و محمد قلی سلیم مشاعرہ داشت، چنانچہ محمد قلی سلیم در غزلے می گوید

کمترند ام از سنجر و فغفور کہ من ہم — در ہند سیہ بختی خود شاہ سلیم

فغفور نے ایک رسالہ اصابع پر لکھا تھا، یہ رسالہ مختصر لیکن مفید تھا[2]، نشتر عشق، صحف ابراہیمی، سرو آزاد، خلاصۃ الافکار میں اس کا سال وفات ۱۰۲۸ھ درج ہے لیکن میخانہ اور عرفات العاشقین میں جو اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں ۱۰۲۹ھ ہے[3]، میخانہ میں ہے کہ اس کا مدفن آگرہ کی شاہراہ پر الہ آباد سے نیم کروہ پر واقع ہے، صالح تبریزی نے جو تفنگ سازی کے فن میں بڑی شہرت رکھتا ہے فغفور کی تاریخ وفات کہی جو لوح مزار پر کندہ کر دی گئی

رفت فغفور سخن از ملک نظم — داغہا بر سینۂ احباب ہست
تا دہد آب از سحاب چشم ما — گوہر یکدانہ را در خاک کشت
چوں بہشتی بود شد تاریخ او — ہم نوا با عندلیبان بہشت[4]

فارسی کے جن تذکروں نے فغفور کا حال لکھا ہے، اس میں عموماً اس کے تبحر علمی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا ہے، طاہر نصیرآبادی نے اس کا دیوان دیکھا تھا، "قریب بہ چہار بیت دیوانش بہ نظر رسیدہ"[5]۔ اس کے علم و فن کے بارے میں مختلف تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، ذیل میں چند آراء درج ہیں:

[1] قلمی، بانکی پور، ص ۱۴۱ الف [2] عرفات العاشقین (قلمی، بانکی پور) ص ۵۰۱ الف [3] میخانہ میں درج ہے کہ دکن سے الہ آباد آنے کے دو سال بعد فغفور کا انتقال ہوا جو غلط ہے، تزک جہانگیری اور عرفات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہزادہ پرویز ۱۰۲۵ھ میں دکن سے الہ آباد آیا، خود میخانہ میں اسکی تاریخ وفات ۱۰۲۹ھ درج ہے، جس کی تائید عرفات سے ہوتی ہے، اس طرح دکن سے الہ آباد آنے کے دو سال نہیں بلکہ چار سال بعد فغفور کا انتقال ہوا تھا [4] میخانہ ص ۲۲۶ [5] قلمی، بانکی پور ص ۱۴۱ الف،

"سید زادهٔ عالی فطرت والی فکرت متجمع فضائل ..... جامع کمالات حاوی حالات، معدن حکمت و فرہنگ مرآت مبرا از زنگ قیصر قصور معمور ادبیات عالی فکرت، متوالی نظم خوش ادراک نازک ادای نیکو روشن است خاقان سپاه طبیعتش باخیل فضائل بیشمار فغفور بلاد تحقیق با عساکر کمال بسیار است..... الحق از جملهٔ نوادر و افاضات متتبع اکثر علوم و رسوم کرده در ہنر موسیقی به غایت ماہر است، چنانچه صاحب تصانیف با مزه شده و نسخ و نستعلیق را خوب می نویسد و در شطرنج بازی از نگه بانان عرصه ندانست شیوهٔ نظمش از آب حیات گوارا تر و از دم عیسی جان فزا تر است در اقسام سخن نادر و ماہر آمده ...." (عرفات العاشقین[1])

"...... حاوی فنون و فضائل بوده علی الخصوص در علم موسیقی کمال مہارت داشت، در شیوهٔ شاعری نیز مراتب اعلیٰ دارد، حکیم در غزل بے بدل است، در دیوانش معنی ہائے بکر بسیار است ......" (مخزن الغرائب[2])

"خاقان ترکستانِ سخنوری و مسیح بیمارستانِ معنی پروری است، نفس پاکش، شفا بخش اذہان سقیم و شربت ادراکش روح افزای ابدانِ الیم بوده در موسیقی گوے سبقت از زہرهٔ چنگی می ربوده و در نبض شناسی قانونِ کمالات و یگانهٔ دہر و در ارغنون نوازی بزم ہنر مندی وحید عصر بود ......" (ریاض الشعراء[3])

"طبیبش خالی نیست...... در طبابت ہم دستے داشت ......" (تذکرهٔ طاہر نصیر آبادی[4])

"در اجلهٔ اطبا، و موسیقی دانان و شعرا محسوب می گردد...... بسلطان پرویز متوسل گردیده و در کمال مروت و حرمت اوقات بسر برده ......" (خلاصة الافکار[5])

"...... در خوش نویسی و طبابت و شعر گوئی ممتاز اقران بود...... از شاہزاده

---

۱ قلمی، بانکی پور، ص ۱۵۷ الف ۲ ایضاً ص ۴۴۹ ۳ ایضاً ص ۳۰۶ الف ۴ ایضاً ص ۱۴۱ الف ۵ ایضاً ص ۱۴۰

پرویز مراعات و دلجوئی یافته ......" (نشتر عشق[1])

"...... از سادات لاہجان و بلند فطرتان زمان خود است، در فن طبابت و شعر و خوش نویسی دستے بکمال داشت...... تتبع اکثرے از علوم نموده قصائد به قدرت تمام می گفت و غزلیاتش ہم سیر نمک است و در فن موسیقی و شطرنج بازی به غایت ماہر بود ......" (صحف ابراہیم[2])

"در فن طبابت و شعر و خوش نویسی ممتاز زمان بود ...... شاہ مصوران کشور فصاحت است و خسرو نقش طرازان قلمرو کتابت ...... نقاش فکرت به این حسن تصاویر می کشد[3]

"...... حکیم فغفور یگانهٔ سخن سرایان دہر و نادرهٔ صیرفیان این عصر است، نکته سنجی قدرت آثار و سخن وری تمام عیار است، به فرط کیاست و دانش و وفور فراست و بینش از اکثر ناظمان نامی این عہد ممتاز و در شعر فہمی و تازه گوئی بے انباز بود، در فن حکمت نہایت حذاقت و خط نستعلیق را به غایت خوب می نوشت و علم موسیقی را نیکو می دانست ..." (میخانه[4])

فغفور کی شاعری پر ایک نظر

فغفور کی غزلوں کا دیوان یا کلیات دستیاب نہیں ہو سکا، مختلف تذکروں میں اس کی چند غزلیں، غزلوں کے متفرق اشعار، قصائد کے کچھ اشعار، چند رباعیاں اور ایک ترجیع بند ملتا ہے، لیکن قصائد کے اشعار اور رباعیاں تعداد میں اتنی کم ہیں کہ ان کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تذکرهٔ میخانه میں فغفور کا ایک طویل ترجیع بند درج ہے، اس ترجیع بند میں پندرہ بند ہیں اور ہر بند میں بیت ترجیع ملا کر آٹھ اشعار ہیں، اس طویل مسلسل نظم کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف تذکرہ نگاروں نے فغفور کی نکتہ سنجی کی جو تعریفیں کی ہیں وہ صرف شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے، میخانہ میں ساقی ناموں اور اس قسم کی دوسری نظموں کی بڑی تعداد ہے، جن میں شراب، اس کے متعلقات اور اس کی کیفیات کا بیان ہے، ترجیع بند کا موضوع بھی یہی ہے، جہاں تک خیال کی پرواز اور بیان کی دلآویزی کا تعلق ہے، فغفور

---

۱ قلمی، بانکی پور، ص ۱۴۴، ۱۴۳ ۲ قلمی، ذخیرہ کتب خانہ نادر، آغا لکھنوی، ص ۲۰۸، ۳۰۴ ۳ طاہر آزاد، ص ۷۹ ۴ مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۱-۲۳۲

کی نظم کو میخانے کی دوسری بہت سی نظموں پر فوقیت حاصل ہے، اس موازنہ کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے، تذکروں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فغفور شراب پیتا تھا، لیکن اس کی پوری نظم میں ایسی سرمستی اور سرشاری ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فغفور شب و روز دختِ رز سے ہم کنار رہتا تھا ممکن ہے وہ شراب نہ پیتا ہو اور میگساری کے انداز اور نشے کی کیفیات کا اندازہ اس کو اپنے مربی شاہزادہ پرویز کی صحبت میں ہوا ہو، پرویز کی مے کشی بلکہ بلانوشی مشہور ہے، کثرت میخواری ہی سے وہ جوانی ہی میں فوت ہو گیا^ل، فغفور اپنے محسن کی بزم آرائیوں میں شریک رہتا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے خُم کے خُم لنڈھائے اور مے آتشیں کے جام پر جام چڑھائے جاتے رہے ہوں گے، اگر فغفور خود شراب نہ پیتا رہا ہو تب بھی اس ماحول میں اس کی شاعرانہ ذکاوت حس نے مے گساری کے اسرار و رموز کو خوب سمجھ لیا ہوگا، زبان پر پوری قدرت اور خیالات میں پرواز کی صلاحیت تھی، اسی لیے شراب سے متعلق ایسی لطیف اور "نشیلی" نظم کہہ سکا، ان اشعار سے بڑی رندی اور سرمستی کا اظہار ہوتا ہے،

ساقی بدہ آں بادہ کہ خورشید شرار است چوں آتشِ گل ریزہ بدامان بہار است
آں آتشِ بے دود کہ سوزش مجوسیست وان نور فروزندہ کہ سوزندہ نار است
چوں غنچۂ جامش زدم غنچہ بخندد گوئی کہ لبالب دہنش از لب یار است
برخاست دل باز جہاں تا بہ مے افتاد از غرقۂ ایں بحر دو عالم بکنار است

ما دجلہ کشی یاد گرفتیم از استاد
مارا خط بغداد بہ از خطۂ بغداد!

ل جہانگیر تزک میں لکھتا ہے: "شاہزادہ پرویز از فرط بادہ پیمائی بمرض صرع مبتلا شدہ دفعۃً از خود رفت بہم رسانیدہ و قوی بتحلیل رفت و ہرچند اطبا بمعالجات و تدبیرات پرداختند چوں قضا بکار گزیر رسیدہ بود، اثرے براں مترتب نگشت و شب چہار شنبہ بتاریخ ہفتم شہر صفر سنہ ہزار و سی و شش ہجری پیمانۂ حیاتش لبریز گردید"

رفتیم بیکبارہ رہ دیر و حرم را یکدست گرفتیم صمد را و صنم را
دریوزہ گر کوے خرابات مغانم در کاسۂ سر ریختہ ام حق قدم را
ما مست شرابیم چہ دریا چہ قطرہ دیریست کہ نہ بیش شناسیم و نہ کم را
تو منکر پیمانہ و من منکر پیماں زاہد! نہ خورم جاے مے تا نبسیم را
جام عرقی خوشترم آید ز عراقین مستاں چہ شناسند عرب را و عجم را

ما دجلہ کشی .... الخ

فغفور مے خانہ اور مے خواری کی خصوصیتوں اور کیفیتوں کا اس طرب انگیز انداز میں ذکر کرتا ہے کہ خیام کی مے پرستی و سرشاری یاد آجاتی ہے:

چوں خوشۂ پروین کہ از و نور فشردند از بہر دل ما دل انگور فشردند
از جنت میخانہ بہ نوش از کف غلماں آں بادہ کہ گوئی ز لب حور فشردند
سرمستی دو دیوانہ دلی قسمت باشد آں روز کہ در مغز جنون شور فشردند

ترجیع بند کی دوسری نمایاں خصوصیت اس کی موسیقیت ہے، اس میں قافیہ اور ردیف زیادہ تر ایسے استعمال کیے ہیں جن سے دلکش صوتی ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے، اس غنائیت کا لحاظ الفاظ کے انتخاب میں بھی رکھا گیا ہے، موسیقی کا ماہر تھا، زبان پر قدرت تھی، ترنم الفاظ کو برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ بھی تھا، اس لیے ساقی نامے میں بڑی لطیف نغمگی جا بجا ملتی ہے،

از بسکہ سرم ہم چو کدو رست پر از مے چوں شیشہ چکد بادہ ام از طرۂ طرار
ما جام نہ نوشیم مگر جام لبالب ما کاسہ نہ گیریم مگر کاسۂ سرشار
زاہد! اگرت میل سبکساری جاں است بر دوش سبو گیر کہ سجادہ گراں است
اینجا نہ مہ و ہفتہ حساب است و نہ روز است اینجا نہ شب جمعہ نہ روز رمضان است

در جام خزان است کہ در عین بہار است ۔۔۔ در بزم بہار است کہ در عین خزان است

ساقی ہمہ یک دور بدہ قسمت ما را ۔۔۔ تا دورِ دگر ہستی ما را کہ ضمان است

گر خانہ بر یغمائے عسس رفت چہ نقصان ۔۔۔ صد شکر کہ جاں در گرو رطل گران است

فغفور نے اس نظم میں پے در پے تلمیحات کے استعمال سے حسن پیدا کر دیا ہے، موسیٰ، منصور، داؤد، یوسف، جمشید، خضر، عیسیٰ، تہمتن، زال، سیاوش، نوح، چشمۂ حیواں کی طرف اشارے ملتے ہیں، ان تلمیحات سے جابجا بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، فغفور نے اس نظم میں ثقیل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثلاً غرقہ، شغشہ، مرغولہ، دائرہ ارزق، نیما، لجہ اخضر وغیرہ لیکن اس سے نظم کی لطافت مجروح نہیں ہونے پائی ہے،

فغفور کی غزل گوئی

فغفور کی غزلوں میں اچھے برے دونوں طرح کے اشعار ملتے ہیں لیکن "جو برے ہیں وہ بہت برے نہیں، جو اچھے ہیں وہ بہت اچھے"، عرفی، نظیری، صائب وغیرہ کی طرح فغفور کا اپنا کوئی مخصوص "رنگ شاعری" نہیں ہے، زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جو اس زمانہ کی عام روش کے مطابق کہے گئے ہیں، پھر بھی طرز ادا کی دلکشی کی وجہ سے اس کے فرسودہ مضامین کے حامل اشعار ذوق لطیف پر بار نہیں ہوتے، مثلاً

سررشتۂ ترانہ بہ دیوانگی کشید ۔۔۔ تارے مگر ز زلف تو بر ساز بستہ ایم[1]

بیا کہ تا تو گرفتی کنار ز آغوشم ۔۔۔ گرفتہ حسرت آغوش در کنار مرا

خون از کرشمہ در دل تنگم چہ می کنی ۔۔۔ در شیشۂ شکستہ چہ ریزی گلاب را

از رشک مبادا کہ نسیمش برباید ۔۔۔ بر گوشۂ دستار تو گل ریشہ دواند

[1] اس طرح میں فغفور اور تذکرہ عرفات العاشقین کے مؤلف نے آگرے میں ساتھ بیٹھ کر غزلیں کہی تھیں، لیکن مؤلف نے صرف فغفور ہی کی غزل درج کی ہے۔ (دیکھیے عرفات العاشقین قلمی، بانکی پور کتب خانہ ص ۵۱۱ الف)

دل دیوانہ را شہر است زندان ۔۔۔ خوشا صحرا خوشا صحرا نشیناں

نے عندلیب برخورد از ما نہ باغباں ۔۔۔ خود را بہ شاخ چوں گل پژمردہ بستہ ایم

ذیل میں فغفور کی غزلوں کے ایسے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو دونوں حیثیتوں سے بلند پایہ ہیں:

ناخدا گو از پر پروانہ سازد بادباں ۔۔۔ زانکہ ما را زورق از موم است و دریا آتش است

ایں شیوہ ام ز شمع خوش آمد کہ ہیچ گاہ ۔۔۔ پروانہ را نہ سوخت مگر در حضور خویش

نخواہد ماند ایں فارغ دلی بر خود چہ می نازی ۔۔۔ تو ہم روزے چو ما بے صبر و بے آرام خواہی شد

روز محشر چوں برآرم نالۂ "کانیک قاتلم" ۔۔۔ شور برخیزد کہ "تہمت بر مسیحا بستہ"!

پا برانۂ قافلۂ عشق سبک نہ ۔۔۔ نقشِ قدم "گرم رواں" آبلہ دارد

ہمچو روزن بر درِ مشرق زمی دوزیم چشم ۔۔۔ ما کلید صبح پیش آفتاب انگندہ ایم

در عشق چو سبابہ بہ تسبیح شماراں ۔۔۔ صد عقدہ بہ پیش آمد و از راہ نہ گشتم

تارے ز زلفِ خویش بہ سوئے چمن فرست ۔۔۔ شاید کہ چاک پیرہن گل رفو کنند!

تو باغ دل کشائی و ما ابر نو بہار ۔۔۔ خندیدن از تو خوش بود و از ما گریستن

بر دم تیغ قاتلم آب بقا حسد برد ۔۔۔ خضر کجاست تا نہد لب بہ لب جراحتم

فغفور چو خاکے کہ بود ہمسفر باد ۔۔۔ گشتیم جہاں یکسر و دل خواہ نہ گشتیم

ہنوز از کفر زلفش رنگِ صد آلودگی دارد ۔۔۔ بہ چندیں آب اگرچہ خرقۂ ایمان خود شستم

خرابات است و مے در جوش و مطرب سرخوش آنجا ۔۔۔ سبو افتان و خیزاں در سماع از چنگ در دو آنجا

یہ ان جواہر پاروں کا ایک مختصر نمونہ ہے، جو مختلف تذکروں میں بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہیں، فغفور کا کلیات دستیاب ہو جائے تو کیا عجب کہ جہانگیر کے عہد کی فارسی شاعری کے خزانہ میں آبدار موتیوں کا قابلِ قدر اضافہ ہو جائے!

تذکرۂ لباب الالباب

تالیف

محمد عوفیؒ کا ایک اہم مخطوطہ

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

لباب الالباب فارسی شعراء کا قدیم ترین تذکرہ ہے[1]، اور بعض وجوہ سے اہم ترین بھی ہے[2]، اسکی اہمیت کے پیش نظر مشہور مستشرق پروفیسر ای، جی، براؤن (Browne) نے اس کی دوسری[3] جلد "متون تاریخی فارسی" کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۰۳ء میں بڑے اہتمام سے شائع کی، اور پہلی جلد مرزا محمد بن

---

[1] مؤلف کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ لباب الالباب ج ۲ [2] اس تذکرہ سے پہلے کی صرف دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے جو تذکرہ کے مشابہ ہیں، ایک مناقب الشعراء، تالیف ابوطاہر خاتونی جو اواخر قرن پنجم و اوائل قرن ششم ہجری کا ایک مصنف گزرا ہے، دوسری چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی جو سنہ ۵۵۰ھ ہجری کے حدود میں مرتب ہوئی، مگر ان میں سے کسی ایک کا مقصد اولین ترجمہ احوال شعراء نہ تھا، مناقب الشعراء جو نایاب ہو چکی ہے، بظاہر شاعروں کی حکایتوں، مشاعروں وغیرہ پر مشتمل ہوگی، چہار مقالہ بادشاہی کے چار خواص، دبیر، شاعر، منجم اور طبیب کے متعلق حکایات وغیرہ پر مشتمل ہے، اس لیے ان کو حقیقۃً تذکرۂ شعراء نہیں کہا جا سکتا، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ لباب (ج ۲) نوشتہ مرزا محمد قزوینی ص و تا ح) یہ تذکرہ ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین الحسین بن شرف الملک رضی الدین ابی بکر اشعری کے نام سنہ ۶۱۸ھ کے قریب ملتان (اچہ) میں لکھا گیا [3] مقدمہ میں مرزا محمد نے اسکی اہمیت پر بحث کی ہے، ملاحظہ ہو ص ط [4] پروفیسر براؤن نے انگریزی مقدمہ (ج ۲ ص ۹-۱۰) میں اس حصہ کو مقدم کرنے کے چھ وجوہ بیان کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حصہ ان شعراء کے حالات پر مشتمل تھا جو بہت اہم تھے، پہلے حصہ میں صرف بادشاہوں، امیروں، وزیروں کی شاعری کا ذکر پایا جاتا ہے،

عبد الوہاب قزوینی کی شرکت میں تین سال بعد لندن ہی سے شائع کی، اگر تذکرۂ مذکور کے نسخوں کی قلت اور زیر استعمال نسخوں کے نقائص کی بنا پر مطبوعہ نسخے میں کافی جگہیں خالی پڑی رہ گئی ہیں، پروفیسر براؤن کو بڑی تلاش کے بعد لباب الالباب کے صرف دو نسخوں کا پتہ چل سکا، ان ہی کی مدد سے انھوں نے اپنا ٹکسٹ تیار کیا، ان نسخوں کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

(۱) نسخۂ مملوکۂ جے، بی، الیٹ (Elliot) حجم ۴۰۰ صفحہ، سائز ۱۱×۲۵ء۹؛ ۱۵ء۱۵ سینٹی میٹر ۱۹ سطری، خط عمدہ صاف ہندوستانی نستعلیق سنہ کتابت ندارد، بظاہر سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی کا ترقیمہ اور جگہ جگہ تصحیح کیا ہوا ہے، کچھ حصہ قدیم خط میں ہے، اوراق کرم خوردہ اور چند نسخے درج حاشیہ ہیں، بعض جگہ پوری سطر یا اس کا زیادہ حصہ بیاض ہے، جس سے اس نسخے کے منقول عنہ کا نقص ظاہر ہوتا ہے، حاشیہ کے خراب ہو جانے کی وجہ سے جو نسخے حاشیہ میں درج کیے تھے، ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکے ہیں،

یہ نسخہ فروری سنہ ۱۸۴۸ء کے قبل مسٹر نتانیل بلنڈ (Nathaniel Bland) کے مطالعہ میں آیا، انھوں نے ایک مضمون "بعنوان "قدیم ترین تذکرۂ شعرائے فارسی تالیف محمد عوفی و بعضے تالیف دیگر از قبیل تذکرۃ الشعراء" رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل (لندن) کی نویں جلد (ص ۱۱۲-۱۲۶) میں شائع کیا، بظاہر مسٹر بلنڈ نے یہ نسخہ مسٹر الیٹ کو واپس نہیں کیا، چنانچہ ان کی ناگہانی موت پر ان کی اور کتابوں کے ساتھ یہ بھی بک گیا، لارڈ کرافورڈ (Crowford) نے ان تمام کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جس میں لباب الالباب کا ذکر مخطوطہ نمبری ۳۰۸ (ص ۲۲۶) کے ذیل میں ملتا ہے، فروری سنہ ۱۸۹۸ء میں پروفیسر براؤن کو اس نسخے کا علم ہوا، انھوں نے لارڈ کرافورڈ کے توسط سے کتاب خانے کے مہتمم مسٹر جے، پی، اڈمنڈ (Edmond) سے خط و کتابت کی اور ایک ماہ کے اندر ہی یہ نسخہ پروفیسر براؤن کے مطالعہ میں آگیا اور تین سال سے زیادہ ان کے پاس رہا، اس درمیان میں انھوں نے تقریباً پوری کتاب

کی نقل کرلی، صرف درمیان کے ۱۴۰ صفحے نقل کرنا باقی تھے کہ دفعتہً وہ نسخہ واپس کردینا پڑا جو لارڈ کرافورڈ

کے پورے کتاب خانے کے ساتھ مانچسٹر کی مسز رلنڈس (Mrs Rylands) کے

ہاتھوں بک گیا، اور اب وہ ان ہی کی ملکیت میں ہے،

(۲) نسخۂ کتاب خانۂ شاہانِ اودھ، حجم ۱۶۸ صفحہ، سائز ۲۶٫۵ × ۱۷٫۲ سینٹی میٹر، ۲۱ سطری

ناقص الاول والآخر، خاتمہ کی عبارت نہیں ہے، اس لیے نہ کاتب کا پتہ ہے اور نہ سنہ کا، البتہ خط سے

جو عمدہ نستعلیق ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے نسخہ سے قدیم ہوگا۔

اس نسخہ کا تعارف اسپرنگر نے اودھ کٹیلاگ جلد اول (ص ۱-۶) میں کرایا ہے، اب یہ نسخہ

برلن کی رائل لائبریری میں منتقل ہوگیا ہے، اور اس کا ذکر مسٹر (Bertek) نے

Bibliothekazn Berlin کے صفحہ ۵۹۶-۵۹۷ پر کیا ہے، پروفیسر براؤن کو یہ

نسخہ ۱۹۰۸ء میں ملا، انھوں نے الیٹ کے نسخے سے جتنا حصہ نقل کیا تھا، اس کا اس سے مقابلہ کرلیا،

اور جو صفحے نقل سے رہ گئے تھے، ان کی بھی نقل حاصل کرلی۔

رضا قلی خاں ہدایت نے مجمع الفصحا میں لباب الالباب سے کافی استفادہ کیا ہے، اس سے

یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس تذکرہ کا ایک نسخہ زمانہ قریب[۲] تک ایران میں موجود تھا، مرزا

محمد قزوینی نے آقاے ذکاء الملک رئیس دار الترجمہ ہمایونی سے جن کو رضا قلی کے خاندان سے خصوصیت

تھی، استدعا کی کہ یہ نسخہ کہیں سے فراہم کیا جائے، مگر ذکاء الملک کی عدم حصول یابی کے جواب

پر مرزا محمد لکھتے ہیں[۳]:

امید کہ ایں جواب فقط عذر باشد براے بیروں نہ دادن کتاب و اگر خدا ے نخواستہ

حقیقت باشد و اصل کتاب از دست ایشان بیروں نہ رفتہ است تاسف براں نہایت ندارد

---

[۱] مقدمہ انگریزی نوشتہ پروفیسر براؤن ص ۲۷، [۲] یہ کتاب طہران میں ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوئی [۳] مقدمہ فارسی ص "د"

اس تلاش و جستجو کے دوران میں مرزا محمد کو برٹش میوزیم لندن میں ایک تذکرہ شعرا موسوم

بہ بزم آرا ملا، جس کے مولف سید علی بن محمود الحسینی نے قدیم زمانے سے لے کر ۱۰۰۰ ہجری تک کے

فارسی شعراء کے حالات اس میں درج کیے تھے، یہ تذکرہ عہد اکبری میں ہندوستان میں مرتب ہوا

تھا، اس میں مولف نے پورا لباب الالباب شامل کرلیا تھا، مگر یہ اس مولف کی انتہائی بددیانتی

ہے کہ اس نے لباب الالباب کا نام کہیں بھی نہیں لکھا، مرزا محمد لکھتے ہیں[۱]،

تقریباً تمام لباب الالباب عوفی را بہ کم و زیاد استنساخ نمودہ مگر در بعضے موارد کہ

اندکے متن عوفی را اختصار نمودہ چنیں می نمایاند کہ اصلاً از وجود کتاب در دنیا بہ اسم لباب

الالباب اطلاع نہ داشتہ است چہ در دیباچہ کتاب تذکرہا ے کہ پیش از بزم آرا تالیف شدہ

است یکے تذکرۂ دولت شاہ رامی شمرد....... اصلاً از لباب الالباب بیچارہ عوفی کہ

از اول تا آخر حتی دیباچہ و مقدمہ را استنساخ نمودہ اسمے نمی برد،

اس تذکرہ کی دریافت سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گویا لباب الالباب کے تین نسخے پروفیسر براؤن

کے پیش نظر ہوگئے، مگر مرزا محمد قزوینی کا قیاس یہ ہے کہ لباب الالباب کا جو نسخہ صاحب بزم آرا کے

زیر استعمال تھا[۲]، وہ ان دو یورپی نسخوں میں سے یا ان کا منقول عنہ تھا، یا ان کا منقول تھا، کیونکہ

جو غلطیاں اور خامیاں ان نسخوں میں پائی جاتی ہیں وہی بعینہ بزم آرا میں بھی موجود ہیں،

اس تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لباب الالباب کے نسخے بید کمیاب

ہیں، خوش قسمتی سے اس کا ایک عمدہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے، اس کا تعارف

ذیل کے اوراق میں پیش کیا جاتا ہے،

حجم ۲۷۰ ورق، تعداد ورق ۱۱۰ تک ہندسوں میں، ۱۱۱ سے آخر تک رقموں میں درج ہے،

---

[۱] مقدمہ فارسی ج ا ص "ط" [۲] ایضاً

مگر خط بعد کا معلوم ہوتا ہے، گو وہ بھی پرانا ہی ہے، خط نسخ، کاتب نامعلوم، سنہ کتابت ندارد، آخری صفحہ موجود ہے، لیکن کاتب نے عمداً نہ اپنا نام لکھا اور نہ سنہ کتابت ہی درج کیا ہے، ۲۱ سطری، عنوان سرخ روشنائی میں ہیں،

اس کے اوراق اول کا دوسرا صفحہ اصل کاتب کے خط میں ہے، لیکن پہلے صفحے کے ابتدائی گیارہ سطروں کے بعد کسی نے صفحہ پورا کر دیا ہے، مگر خط شکستہ ہے، اس سے اس نسخے کے منقول عنہ کے نقص کا صریحی پتہ چلتا ہے، نیز ۱۲۷ میں ساتویں سطر کے آگے کی سطریں ورق ۲۶۹ کے بعد کی ہیں، ان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس جگہ منقول عنہ کے اوراق بے ترتیب تھے، کاتب کو اسکا احساس نہیں ہوا، اس لیے اس کے یہاں بے ترتیبی دوسری شکل میں ظاہر ہوئی،

لکھنؤ یونیورسٹی کے نسخے میں کافی نقائص ہیں، جو زیادہ تو منقول عنہ کے ناقص ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ اکثر جگہیں خالی پڑی ہیں خصوصاً نسخہ کے دوسرے حصے میں، اور نہ صرف براؤن کے تمام نقائص اس میں موجود ہیں، بلکہ اس سے زیادہ جگہیں بیاض ہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان تمام نسخوں کا منقول عنہ ایک ہی تھا، جس میں زیادہ نقائص پیدا ہونے کی وجہ سے بعد کے نقل کیے ہوئے نسخوں میں اور زیادہ نقائص پیدا ہو گئے، نقائص کا اتحاد صاف پتہ دے رہا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اس کتاب کا صرف ایک ناقص نسخہ موجود تھا، جس سے بعد میں متعدد نقلیں ہوئیں،

نسخہ مذکور میں جرٹ بندی بھی ہوئی ہے، اور بہت سی جگہوں کے الفاظ و فقرات پڑھے نہیں جا سکتے، ذیل میں اس نسخے کے تمام نقائص درج کر دیے جاتے ہیں:

جلد اول ورق ۱ - ۱۲۴ ب[1]

---

[1] یہ الفاظ خاتمہ کے ہیں:- تم النصف الاول من کتاب ... اللہ و توفیقہ، اس کے بعد بغیر جگہ چھوڑے (باقی حاشیہ ۲۱۷ پر)

ورق ۴۱ - ب، آخری ۴ سطریں کٹ گئی ہیں، کچھ ابتدائی حصہ باقی ہے۔

" ۵ " " "

ورق ۱۳۲، ۱۳۳ پر عنوان "ہم او راست" اسکے تحت صرف ایک بیت درج ہے براؤن ج ۱ ص ۷۰ پر اس کا عنوان 'رباعی' ہے اور ایک سطر خالی چھوٹی ہے، جس سے ایک بیت کی کمی ظاہر ہوتی ہے، بہرحال دونوں نسخوں کا نقص یکساں ہے،

ورق ۴۲ ب. صاحب ترجمہ کا نام درج نہیں، یہی نقص براؤن ص ۹۳ پر ہے، مگر خطی لکھنؤ میں جگہ خالی نہیں رکھی گئی ہے"

" " " " ص ۹۴ "

ورق ۷۱ ب، ۷۲، قطعہ میں تین شعر درج ہیں، مگر براؤن (ص ۱۶۲) پر چار شعر بتائے گئے ہیں، جن میں تیسرے کا دوسرا مصرع اور چوتھے کا پہلا غائب بتایا گیا ہے، مخطوطہ کا تیسرا شعر براؤن کے نزدیک تیسرے کا پہلا مصرع اور چوتھے کا دوسرا ہے،

ورق ۱۲۴، صاحب ترجمہ کا نام درج نہیں، مگر اس کے لیے جگہ نہیں چھوٹی ہے، براؤن ص ۲۸۷ پر یہی نقص موجود ہے، مگر اس کے لیے جگہ چھوٹی ہے،

جلد دوم ۱۲۴ ب - ۲۷۰ ب

ورق ۱۴۷ پر "بن احمد البدری" کا نام حسنو پر لکھا ہے، مگر براؤن کے یہاں ص ۷۰، نمبر ۵۹ اس کے لیے جگہ چھوٹی ہے،

ورق ۱۴۷ ب پر براؤن کے اعتبار سے ۵۴ سطریں غائب ہیں (ملاحظہ ہو ص ۸۰ تا ۷۰) دستہ (ص ۷۰، س ۲) سے پھر شروع ہوتا ہے، مگر ابتدا میں یعنی ایشان آمد (براؤن ص ۲۶۶ س

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶) "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بعد ایک مختصر دیباچے کے بعد "باب ہشتم در ذکر لطائف اشعار" شروع ہوتا ہے، نصف اول جو ستاً ابواب پر مشتمل ہے، جو اشعار سلاطین و ملوک و امرا و وزرا و کفاۃ و علما و صدور آفاق پر حاوی ہے

کے بعد "وزمانہ مطواع وچرخ" زیادہ ہیں، حاشیہ پر مصحح کے قلم سے یہ نوٹ ہے "ہشت سطر نماند"
سپرنگر کے نسخہ میں بھی اتنا ہی حصہ بیاض ہے (ملاحظہ ہو براؤن ج ۲، مقدمہ انگریزی ص ۲۶ س ۹)

ورق ۱۸۳ ا پر الحکیم تاج الشعراء محمد بن علی سوزنی کا نام دہرایا گیا ہے، اور یہی دونوں یورپی نسخوں میں بھی ہوا ہے (ملاحظہ ہو براؤن ج ۲، مقدمہ انگریزی ص ۴۳ ملحق بہ ص ۱۹۸)

ورق ۲۰۹ ب (براؤن ۲۶۶) ہر دو ناقص۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۵۲)

ورق ۲۱۵ ا ۵ شعر غائب ہیں، (براؤن ص ۲۸۱، آخری تین سطریں و ص ۲۸۲ پہلی دو سطریں)۔ اور یہی ابیات سپرنگر میں بھی محذوف ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۵۴ ملحق ص ۲۸۱)

ورق ۲۲۳ ب (براؤن ص ۳۰۸ س ۵ ناقص) پر پورا مصرع ہے "گلگون عیش را پس ازیں تنگ تنگ دار"، یعنی دونوں یورپی نسخوں میں تنگ محذوف ہے، براؤن نے قیاسی اضافہ اسی لفظ کا کیا تھا، ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۵۸)

ورق ۲۳۲ ب عنوان غائب مثل براؤن نمبر ۱۲۱ ص ۳۴۶
" ۲۳۴ ب چوتھا شعر دوسرا مصرعہ ناقص براؤن پورا
" ۲۳۵ ا دوسرا شعر دوسرا مصرعہ ناقص براؤن پورا
" ۲۳۹ ب ۱۶ ویں، ۱۷ ویں کے دوسرے مصرعے ناقص
" ۲۴۰ ا تیرہویں شعر کے دونوں مصرعے ناکمل
" ۲۴۱ ب (براؤن نمبر ۱۴۵) سرخی ناقص بعد میں اضافہ وہ بھی ناقص، رباعی (جس میں ۶ مصرعے ہیں) کا پہلا اور تیسرا مصرعہ مثل اسپرنگر (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۶۷)

ورق ۲۴۲ ا سولھواں شعر یعنی مطلع قصیدہ ناقص (صرف دوسرا مصرعہ) یہ مصرعہ سپرنگر میں بھی نہیں ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۶۷، ملحق ص ۳۵۹)

ورق ۲۴۲ ب قطعہ کا مطلع ناقص، مثل سپرنگر (مقدمہ ص ۶۸، ملحق ص ۳۶۱)
" ۲۴۳ ا قطعہ کے آخری دو شعر کے آخری دونوں مصرعے ناقص
ب ۶-۸ شعروں کے پہلے مصرعے ناقص
" ۲۴۴ ا چوتھا اور چھٹا ناقص مصرعہ ثانیہ، چوتھا دوسرے قلم سے پورا کردیا گیا،
ب دوسرے، تیسرے، چوتھے کے پہلے مصرعے ناقص
" ۲۴۴ ب-۲۴۵ ا قطعہ کے پہلے تین شعر بالکل ناقص، ۲۴۵ ا میں آخری کے پہلے دو کے دو اول مصرعے ناقص،

ورق ۲۴۵ ب اسی کے آخری تین شعر کے آخری مصرعے غائب
" ۲۴۶ ا قصیدے ۵-۷ کے پہلے مصرعے ناقص (ب) ۱۱، ۱۲، ۱۳ تقریباً دونوں مصرعے غائب،
" ۲۴۷ ا " ۷-۸ پہلے مصرعے ناقص (ب) ۶-۷ دوسرے مصرعے غائب
" ۲۴۸ ا آخری تین کے پہلے مصرعے ناقص (ب) پہلے تین کے آخری مصرعے غائب آخری دو کے پہلے مصرعے ناقص

ورق ۲۴۹ ا پہلے کا پہلا اور آخری بیت سے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ناقص، دوسرے بالکل غائب

ورق ۲۴۹ ب ۱۵ واں کا پہلا مصرعہ اور ۲۰ واں پہلا مصرع ناقص
" ۲۵۰ ا دوسری رباعی کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ غائب
" ب تیسری رباعی کا تیسرا اور کا پہلا مصرعہ ناقص،
" ۲۵۱ ا آٹھویں، نویں اور دسویں سطریں ناقص (ب) آخری دو سطریں ناقص،
" ۲۵۲ ا پہلی سطر ناقص (ب) ۱۴-۱۵ کے آخری مصرعے غائب، اور ۱۶-۱۷ پہلے ناقص، اور دوسرے غائب

ورق ۲۵۳ا غزل کے پہلے دو شعر کے پہلے مصرعے ناقص (ب) ۸-۱۱ کے پہلے مصرعے ناقص دوسرے غائب،

" ۲۵۴ا غزل کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ناقص (ب) قطعہ کا دوسرا شعر اور صفحہ کی تیسری سطر ناقص، دوسرے قطعہ کا دوسرا مصرعہ ناقص

ورق ۲۵۵ا کی پہلی چار سطریں اور آخر سے پہلے سطریں (نظم و نثر) ناقص (ب) قصیدہ ۷،۴ کے پہلے مصرعے ناقص،

ورق ۲۵۶ا بارہویں سطر (دوسرا مصرعہ۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ) ناقص، تیرہویں تا پندرہویں ناقص و نامکمل، ۱۴ کا پہلا مصرعہ ہے،

ورق ۲۵۶ب ۴، ۵ شعر پہلا مصرعہ ناقص، ۶ پورا شعر محذوف، ۷ پہلا مصرعہ ناقص، ۸ پہلا مصرعہ (ایک لفظ غائب) مرثیہ کی دوسری بیت کا پہلا مصرعہ ناقص،

ورق ۲۵۷ا قصیدے کی ۳، ۴، ۵ بیت ناقص (ب) ۵ کا پہلا، ۷ کا پہلا اور دوسرا ناقص ۶ کا صرف دوسرا ناقص،

ورق ۲۵۹ا قصیدہ کی ۳-۵ ناقص (ب) پہلی تین بیت ناقص، اور آخری تین سطریں نظم و نثر ناقص

" ۲۵۹ا ۱۴-۱۵ ناقص، ۱۷ ویں سطر کے چند لفظ غائب (ب) ۱۱، ۱۲، ۱۳ سطریں (نظم) ناقص

" ۲۶۰ا ۹-۱۲ سطریں (نظم و نثر) ناقص (ب) ۶-۹ سطریں (نظم و نثر) ناقص

" ۲۶۱ا دوسری تیسری سطریں ناقص۔ پہلا مصرعہ کا نقص مخطوطے میں ظاہر ہے، مگر کاتب نے دوسرے مصرعہ کا نقص ظاہر نہیں کیا، آخری دو بیت ناقص (مثل براؤن ص ۷، ۴، ۵ نیز مقدمہ ص ۶، ۷)

ورق ۲۶۱ب۔ براؤن کی طرح اول دو سطریں ناقص، پہلے مصرعوں کے اسی قدر لفظ ملتے ہیں جتنے براؤن میں ہیں، آخری تین سطریں ناقص مثل براؤن، پہلے مصرعوں کے دیئے ہوئے

الفاظ مثل براؤن، اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یا تو یہ یورپی نسخوں سے منقول ہے یا ان کے منقول عنہ سے ہے، (براؤن ص ۴۰۸)

ورق ۲۶۲ا کے پہلے شعر کے ابتدائی چند لفظ چٹ بندی میں محذوف اور براؤن میں پورے ہیں۔ ۱۶ تا ۱۸ سطریں (شعر) نامکمل ہو بہو مثل براؤن،

ورق ۲۶۲ب۔ وہی چٹ بندی۔ پہلی ۵ سطروں کے آخری، ۶ تا ۹ کے ابتدائی الفاظ محذوف (براؤن میں پورے) اسی صفحہ کی غزل کی تیسری بیت کے پہلے مصرعے میں ایک آدھ لفظ محذوف مثل براؤن، دوسرا مصرعہ ناقص (گو کاتب نے جگہ نہیں چھوڑی) مثل براؤن، تیسری کا پہلا مصرعہ ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۰) مگر براؤن میں ایک بیت زیادہ جس کا پہلا مصرعہ ناقص، مگر وہ مخطوطے میں نہیں،

ورق ۲۶۳ا قطعہ کا آخری شعر ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۲) اسی ورق پر عنوان کے ساتھ ۴ سطریں ناقص (مثل براؤن) بعد میں دوسرے قلم سے اضافہ ہوئی ہیں،

ورق ۲۶۳ب۔ ۱۰-۱۱ سطریں ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۳)

" ۲۶۴ا۔ ۷-۱۰ بیت ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۳) ۱۱-۲۱ ابتدائی سطریں ناقص چٹ بندی میں، براؤن میں پوری ہیں،

ورق ۲۶۴ب ۵-۷ بیت ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۴) آخری دس سطروں کے آخری لفظ ناقص چٹ بندی میں، براؤن میں پوری ہیں،

ورق ۲۶۵ا رباعی اول و دوم ناقص مثل براؤن (۴۱۵-۴۱۶) قطعہ کی آخری بیت کا پہلا مصرعہ ناقص مثل براؤن (۴۱۷)

ورق ۲۶۵ب پہلی رباعی ناقص مثل براؤن (۴۱۷) ۱۸-۲۰ ناقص مثل براؤن بعد میں پوری کی گئی ہیں،

" ۲۶۶ا ۱۵-۱۶ سطریں ناقص مثل براؤن (۴۱۸)

ورق ۲۶۶ ب ۸ - ۱۱ سطریں (شعر) ناقص براؤن میں پوری ہیں،

" ۲۶۷، ۵، ۱۰- ۷ سطریں ناقص، اس صفحہ کے آگے کی سطروں کی ترتیب الٹی ہی، یہ سطریں ورق ۲۶۹ کی پانچویں سطر سے پہلے کی ہیں۔ گویا ۲۶۷، (۷ ویں سطر کے بعد) ورق ۲۶۹ ب کے بعد (۹ ویں سطریں بعد) ہوگا۔ اس صفحہ کے صاحب ترجمہ کا نام مخطوطے اور براؤن میں محذوف ہے، بعد میں کچھ دوسرے قلم سے پورا ہوا ہے، آخری سطر ناقص مثل براؤن (۲۲۴)

ورق ۲۶۷ ب، ابتدائی تین سطر ناقص مثل براؤن بعد میں اضافہ، آخری ۳ سطر ناقص مثل براؤن، ۲۶۸ پہلی سطر ناقص مثل براؤن (ص ۲۲۵) اسی پر صاحبِ ترجمہ کیا تھا چھ سطریں ناقص مثل براؤن،

اگرچہ زیر بحث مخطوطہ کافی ناقص ہی لیکن جیسا کہ بار بار اشارہ کیا جا چکا ہی، یہ اس نسخہ کا نقص نہیں، بلکہ اس کے منقول عنہ کا نقص ہی، اس میں یہ سب جگہیں خالی پڑی ہیں، باوجود اس نقص کے اسکی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، چونکہ اسمیں براؤن سے زیادہ خالی جگہیں ہیں، اس سے اس قیاس کو پوری تقویت پہنچتی ہی کہ یہ نسخہ اس نسخے سے منقول ہی جو ان یورپی نسخوں سے یا تو بعد میں نقل، ہوا ہی یا خود انکے منقول عنہ سے بعد میں نقل ہوا، نقائص کا اتحاد صاف بتا رہا ہے کہ اصلاً ایک ہی نسخہ ناقص تھا، اور اسی سے دوسرے تمام نسخے منقول ہوئے، لکھنؤ مخطوطہ کے بیشتر نقائص اسپرنگر کے مخطوطے کے مشابہ ہیں،

اس نسخے پر اول سے آخر تک کسی نے دوسرے نسخہ کی مدد سے نظر ثانی کی ہے، کہیں کہیں اضافہ بھی کیا ہے، گمان اس اضافہ و تصحیح سے براؤن کی مرتب کی ہوئی ٹکسٹ کی ایک آدھ خالی جگہیں پر ہو سکتی ہیں، مگر بیشتر ویسی ہی ہیں، اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ مصحح کے پیش نظر بھی ناقص ہی نسخہ تھا، زیر بحث نسخہ کا صفحہ اول مصحح ہی کے قلم کا اضافہ ہی جس میں ۱۱ سطریں کم ہیں، اس سے بھی مصحح کے زیر استعمال نسخے کا نامکمل ہونا واضح ہے،

بہرحال اس نسخہ کی دریافت اہل علم کی خوشی کا موجب ہوگی،

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوبِ سلیمانی

بنام نواب سید امیر حسن خانصاحب

Royal Court Hotel
Sloane Square
LONDON, S.W.1

A. Wild
of Cairo

عزیز مکرم

سلام علیکم، آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶ رفروری یہاں ۱۸ رمارچ کو پہنچا، آپ لکھتے ہیں کہ ابتک ہمارے پہنچنے کی اطلاع ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی جس دن آپ خط لکھ رہے تھے عین اسی دن ہمارا جہاز رودبار لندن میں لنگر انداز ہوا،

............[1] ممبران ہاؤس آف لارڈس اور ہاؤس آف کامنس سے ملاقاتیں ہوئیں،

یہ سب کچھ ہوا مگر اصل مقصود کا پتہ نہیں، کوئی ہمارے نقطۂ نظر سے واقعات پر نظر ڈالنے کیلیے آمادہ نہیں، ہندوستان میں یورپ کی بے تعصبی کی داستانیں بہت سنا کرتے تھے، مگر یہاں آکر وہ عقیدہ بدعقیدگی سے بدل گیا، یہاں کے مشرقی ارباب علم کی بے تعصبی اور مشرق پرستی کی بڑی دھوم تھی، وہ بھی دہل نہی ثابت ہوئی، پروفیسر مارگولیوتھ مصنف لائف آف محمد ترکوں کے سب سے بڑے علمی دشمن ہیں،

[1] الفاظ مٹ گئے ہیں،

ڈاکٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ آف اسلام سابق پرفیسر علی گڈھ کالج جن کی تعریف سے ہمارے استاد مولانا شبلی مرحوم نہیں تھکتے تھے، وہ بخاری کے حوالہ سے ثابت کرتے ہیں کہ سلطان خلیفہ نہیں۔

غرض یہاں کے وزرا کو تو بہر حال پیام پہنچ گیا، وزیر ہند کی ملاقات کا حال آپ پڑھ چکے ہوں گے، اب وزیر اعظم کی ملاقات کا حال پڑھیے گا، ہمارے سوال اور ان کے جواب میں وہی نسبت ہے جو آسمان اور ریسمان میں، بھئی! اصلی چیز طاقت ہے، یورپ صرف اسی کو مانتا ہے۔

آجکل یہاں ایسکوتھ اور لائڈ جارج صاحب کی کشتی کی بڑی گرم بازاری ہے، لائڈ جارج صاحب سوشلزم یا اس کے ہیبتناک لفظ بولشوزم سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک نئی لبرل جماعت قائم کرنا چاہتے ہیں، مسٹر ایسکوتھ اس کے مخالف ہیں۔

ووکنگ مشن کو دیکھا، انگریز و نیم نومسلموں سے ملاقات ہوئی، لندن میں ہر جمعہ کو اور ووکنگ میں اتوار کو اجتماع ہوتا ہے، کام کی صداقت میں کلام نہیں، مگر اس سے زیادہ روپیہ اور محنت درکار ہے، ایک دو دفعہ میں نے بھی نماز پڑھائی۔

جناب نواب صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام مسنون، اچھے صاحب کہاں ہیں۔

پتہ کوک کمپنی کا ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۲۴ر فروری سنہ ۲۰ء

مکاتیب شبلی

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے۔

قیمت جلد اول عہ، دوم عہ

"منیجر"

ادبیات

اے ربّ کائنات

از جناب شہ زور کاشمیری

ایقان ہو رہا ہے شکار توہمات — اے رب کائنات!

ایماں پہ ہے تسلط رعب منات ولات — اے رب کائنات!

حاجات نے بدل دیا معیار زشت و خوب — اگلے صفات ہو گئے اب اخل عیوب

اخلاق کا بھی مہر منور ہوا غروب — دنیائے دل پہ چھا رہی ہو معصیت کی رات

اے رب کائنات!

مرجھا گئے ہیں گلشن روحانیت کے پھول — اور ہے بہار صبر و توکل بھی دل ملول

انسان کو بھی صورت تسکیں نہیں قبول — بیکار اب جہان میں ہے صوم اور صلوٰۃ

اے رب کائنات!

صدہا حقیقتوں کو ہے اک جھوٹ کا ہراس — لاتقنطوا کی روح ہوئی ہے اسیر یاس

فطرت بھی ہے اداس، خدائی بھی ہے اداس — جاری یقیں کی آنکھ سے ہے دجلہ و فرات

اے رب کائنات!

باقی نہیں تمدن و تہذیب کے قیود — پامال ہیں شرافت و اخلاق کے حدود

ہے سرکشی کے اوج پہ انسان کی نمود
ٹوٹا ہی چاہتا ہے نظامِ تعینات

اے ربِّ کائنات!

اب منتہائے مقصدِ انساں ہے اقتدار
وہ اقتدار جس میں ہو انصاف کا مزار

انسانیت ہو مردہ، شرافت ہو سوگوار
انساں کا اب خدا ہے یہی اقتدارِ ذات

اے ربِّ کائنات!

جو شام سے ہوں تا بہ سحر محوِ ناو نوش
جنکے دماغ و دل ہوں حسد کیش و بغض کوش

جنکی نظر میں تیری عبادت ہو نقصِ ہوش
ان پر بھلا اثر کرے کیونکر کسی کی بات

اے ربِّ کائنات!

انساں نفاق و بغض و عداوت میں ہے اسیر
رہنِ ہوس ہے اس کا دماغ و دل و ضمیر

اس کی بہارِ فکر ہے محبوسِ زمہریر
دانستہ کھو رہا ہے یہ اپنی رہِ نجات

اے ربِّ کائنات!

غزل

از جناب اشفاق علیخاں صاحب ایم اے آنرز، ال ال بی شاہجہانپور

یہ نظر کا کھیل کب تک؟ تو سکون دے نظر کو
ترا حوصلہ اگر ہو تو اب آزما جگر کو

ہے عبث ابھی دعا میں ترا ڈھونڈنا اثر کو
ابھی ربط تیرے دل سے نہیں تری چشمِ تر کو

کہو اہلِ کارواں سے کریں فکر اپنا اپنا!
کہ سلیقۂ حوادث نہیں انکے راہبر کو

یہ طلسمِ روز و شب ہو کہ فسونِ گنج و راحت
کوئی دے سکا نہ دھوکا مرے فکرِ معتبر کو

ترے آشیاں کے لائق وہ چمن نہیں ہے نادان
کہ خزاں کا خوف رہتا ہو جہاں کے ہر شجر کو

یہ جہان سرد ہو گا ترے اشک و آہِ غم سے
یہ طلسم ڈھونڈتا ہے کسی مردِ باخبر کو

کیا نا امید جس نے تجھے آمدِ سحر سے
اسی شب میں دیکھتا ہوں میں سپیدۂ سحر کو

وہی اس جہاں کا راکب، جہاں اسی کا مرکب
جو بشر نہ لائے خاطر میں کبھی کسی خطر کو

یہی رازِ کامرانی ہے اسی سے کامراں ہوں
کبھی مرحلہ نہ مانا مرے دل نے رہگذر کو

مری زیست جاودانی مجھے غم ہو کیوں جہاں کا
کہ محیط ہے فقط یہ مری عمرِ مختصر کو

مجھے پائمال کرتے ہیں جو آج اپنی ضد سے
وہ رکھیں گے گلِ گرامی مری خاکِ بے سپر کو

غزل

از زائرِ حرم جناب حمید صدیقی

جو یقینِ کاملِ عشق ہو، کوئی چیز وہم و گماں نہیں
مجھے وہ نظر بھی عزیز ہے جو مری طرف نگراں نہیں

ترا اک تبسمِ ناز ہے، رگ و پے میں خون رواں نہیں
ترے فیضِ حسن کی خیر ہو، ترا دردِ عشق کہاں نہیں

کوئی راز اس کا بتائے کیا، کوئی حال اسکا سنائے کیا
وہ مقامِ فکر و نظر کا بھی کوئی دخلِ خاص جہاں نہیں

یہ کہاں سے لائی کہاں مجھے کہ حریفِ شوق ہے بیخودی
وہ زمیں نہیں، وہ زماں نہیں، وہ مکیں نہیں، وہ مکاں نہیں

وہ ہزار حسنِ نظر سہی، وہ ہزار جوشِ اثر سہی
یہ بڑی کمی ہے خیال کی، ترا نام وردِ زباں نہیں

مری ہر نگاہ زباں ہے، مرا ہر سکوت بیان ہے
مرا راز پھر بھی وہ راز ہے جو عیاں بھی ہو کے عیاں نہیں

وہ جو محوِ حسنِ صفات ہے، اسے کچھ سکون سا ہو تو ہو
جو ہلاکِ جلوۂ ذات ہے اسے خلد میں بھی اماں نہیں

غمِ ہجر کے بھی ہزار لطف، حمید تم نے اٹھا لیے
چلو پھر دیارِ حبیب میں کہ سکونِ قلب یہاں نہیں

مطبوعات جدیدۃ

بنگال میں اُردو۔ از جناب وفا راشدی تقطیع اوسط، ضخامت ۲۹۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ص؎ پتہ مکتبہ اشاعت اردو، حیدر آباد سندھ۔

ایک زمانہ میں ڈھاکہ، مرشد آباد اور کلکتہ کا مٹیا برج مسلمانوں کی تہذیب کا مرکز رہ چکے ہیں، اس لیے بنگال میں ہمیشہ سے فارسی اور اس کے بعد اردو کا چرچا رہا، اور وہاں کے اونچے طبقہ کے مسلمانوں کی علمی وادبی اور بڑی حد تک بول چال کی زبان بھی اردو رہی ہے اور اب تک ہے، اور ہر زمانہ میں وہاں اردو کے شاعر اور ادیب پیدا ہوتے رہے، خصوصاً واجد علی شاہ اور انکے ہمراہی شعراء وادباء کی وجہ سے اردو شاعری کو بڑا فروغ ہوا فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کو علمی وادبی زبان بنایا بنگال ہی کی سرزمین میں تھا، ان اثرات سے بنگالی زبان اور بنگالی عوام دونوں متاثر ہوئے، چنانچہ بنگلہ میں بکثرت اردو کے الفاظ ہیں، اور بنگال میں بنگلہ کے بعد اردو ہی بولی اور سمجھی جاتی ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر جب اسلامی دور کی نشانیوں کو مٹانا شروع کیا تو بعض متعصب بنگالیوں نے بھی ان کی تقلید کی جس کی صدائے بازگشت آج تک مشرقی بنگال سے اٹھتی رہتی ہے۔ اس لیے لائق مصنف نے بنگال میں اردو زبان کی تاریخ پر یہ کتاب لکھی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ بنگال سے اردو زبان کا تعلق نہایت قدیم ہے، جو ہر زمانہ میں قائم رہا، کتاب کے شروع میں بنگال میں اردو زبان کی ابتداء اور اس کی ترقی کی مختصر تاریخ ہے، اس کے بعد مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے حالات لکھے گئے ہیں، پہلے دور میں فورٹ ولیم کالج کے خدمات اردو کا ذکر ہے،

دوسرے میں ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۵ء تک اردو شاعری کی ترقی پر تبصرہ ہے، تیسرے اور چوتھے دور میں علی الترتیب ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۱ء تک اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۲ء تک دونوں دوروں کے شعراء اور ادیبوں کے حالات اور ان کے ادبی خدمات کا حال ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو وطناً بنگالی نہیں ہیں، مگر انھوں نے بنگال میں رہ کر کسی نہ کسی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے بعد اردو وفارسی کے ہندو بنگالی شاعروں اور ادیبوں اور مسلمان اہل قلم خواتین کا ذکر ہے، آخر میں بنگال میں اردو صحافت کی مختصر تاریخ، وہاں کی ادبی مجالس کا تذکرہ اور بنگال میں اردو کی جو کتابیں طبع ہوئیں، ان کی فہرست ہے، اس طرح اس کتاب میں بنگال میں اردو کی پوری سرگذشت آگئی ہے، یہ کتاب مشرقی بنگال میں اردو کی مخالفت کا بڑا مدلل اور مفید جواب ہے، اگر ہر دور کے شروع میں اس کی خصوصیات کا بھی تذکرہ کر دیا جاتا تو کتاب اور زیادہ مکمل ہو جاتی، کتابت وطباعت کی غلطیاں بکثرت ہیں۔

مکاتیب اقبال۔ شائع کردہ بزم اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ لاہور، قیمت ؎ کاغذ نفیس، ٹائپ عمدہ، مذکورہ بالا پتہ سے ملے گی،

اقبال کے خطوط کا ایک ضخیم مجموعہ کئی سال ہوئے اقبال نامہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ نیا مجموعہ ہے۔ اس میں صرف ایک شخص خان محمد نیاز الدین خان کے نام ۹۱ خطوط ہیں جن میں دو کے علاوہ سب غیر مطبوعہ ہیں، خان مرحوم ضلع جالندھر کے ایک صاحب علم رئیس تھے، فارسی میں فکر سخن کرتے تھے، اور اقبال سے اصلاح لیتے تھے، ان مکاتیب میں ذاتی حالات اور شعر وادب کے علاوہ علمی و مذہبی، قومی و ملی مختلف قسم کے مسائل کا ذکر بھی جابجا آگیا ہے، جس سے اقبال کے بعض افکار وخیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے عام ناظرین کے ذوق اور دلچسپی کا بھی ان میں سامان ہے، اقبال کی ایمانی حرارت، دینی حمیت، گہری مذہبیت اور اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ بیشتر خطوط میں نمایاں ہے، حُب رسول کی بعض کیفیات نہایت مؤثر ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی میں بسر کرتا ہوں، مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرونِ اولیٰ کی سیر خیالی کیجئے کہ جس زمانہ کا تخیل اتنا حسین و جمیل اور روح افزا ہو وہ زمانہ خود کیسا ہوگا،

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اسکا خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا"

ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں "میں نے نبی کریم کو مخاطب کرکے ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے.... ابھی چند اشعار لکھے ہیں، مگر ان کے لکھتے وقت قلب کی جو حالت ہوئی ہو ایسی حالت عمر بھر نہ ہوئی تھی، دو شعر لکھتا ہوں

بہر نذر آستانت از عجم آوردہ ام سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من" الخ

ان خطوط سے اقبال کے اخلاق و سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے، ظرافت کی چاشنی بھی ہے، اس لیے وہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں،

تبلیغی دورے

از مولانا سید ودود الحق صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۳۸ صفحات، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ (۱) زکریا مسجد اسٹریٹ پھلا الا بمبئی نمبر ۹ (۲) نفیس دواخانہ پیر جلیل، لکھنؤ۔

لائق مصنف ایک عرصہ سے بمبئی میں مذہبی و تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان سے متعلق ان کے مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسالے برابر نکلتے رہتے ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے مشرقی افریقہ کا بھی دورہ کیا تھا، مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، زنجبار میں تو ان کی تعداد ۹۹ فیصدی تک ہے، اور انگریزوں کے زیر سیادت برائے نام ایک سلطان بھی حکمراں ہیں، مصنف نے اس علاقہ کے شہروں اور آبادیوں کا دورہ کرکے دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا، یہ کتاب اسی کا روزنامچہ ہے، اس میں تبلیغی اجتماعات کی روداد اور اس کی تقریروں کے علاوہ وہاں کے دینی و تعلیمی اداروں، ممتاز اشخاص اور مختلف

مقامی حالات کا بھی ذکر ہے، جس سے یہ سفرنامہ بہت مفید اور دلچسپ بن گیا ہے۔

نسیم عرفان

از جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۳، پتہ: آدرش کتاب گھر بلبلی خانہ دہلی،

بھگوت گیتا کے اردو میں کئی منظوم ترجمے ہو چکے ہیں، اردو زبان کے مشہور کہنہ مشق شاعر جناب منور لکھنوی نے بھی عرصہ ہوا ایک ترجمہ کیا تھا، نظر ثانی کے بعد اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، اصل نظم کہنے کے مقابلہ میں کسی نظم یا نثر کا منظوم کرنا بہت مشکل ہے، اور گیتا جیسی دقیق فلسفیانہ اور عارفانہ کتاب کا ترجمہ تو اور بھی دشوار ہے، مگر لائق مترجم اردو زبان کے رمز شناس اور قادر الکلام شاعر ہیں، سنسکرت سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، اور متعدد کتابوں کے کامیاب منظوم ترجمے کر چکے ہیں، اس لیے انھوں نے گیتا کو اس خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ نظم ترجمہ نہیں معلوم ہوتی اور معنی و مفہوم کی صحت کے ساتھ شاعرانہ محاسن سے بھی آراستہ ہے، زبان نہایت صاف، سلیس اور شگفتہ ہے، الفاظ و معنی میں کہیں ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے، اور کتاب کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، حاشیہ میں جابجا تشریح طلب امور کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے، گیتا میں جو نام آئے ہیں، اگر ان کا مختصر تعارف بھی کرا دیا جاتا تو پڑھنے والوں کو اور زیادہ سہولت ہوتی،

کف گلفروش

از جناب غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۷، پتہ (۱) ادارہ فروغ اردو، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

مصنف اردو کے ممتاز ظرافت نگار ہیں، ان کی کتاب "مدا و ادبی حلقہ میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے، کف گلفروش ان کے سولہ ظریفانہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے، مصنف میں طنز و ظرافت کا ملکہ فطری ہے، خصوصاً مضحک خاکہ اڑانے میں ان کو بڑا کمال ہے، اور لکھنؤ کی زبان اور اس کے ٹکسالی محاوروں پر اتنا عبور حاصل ہے کہ غیر لکھنوی میں اس کی مثالیں کم ملیں گی، گو مصنف بھی آدھے لکھنوی ہیں،

جب وہ اس زبان میں بولتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے ننھے نواب، ننھے آغا، دلارے مرزا یا مدک خانے کا کوئی افیچی بول رہا ہے، اس مجموعہ کا کوئی مضمون بھی دلچسپ طنز و ظرافت سے خالی نہیں ہے، اور اس میں ہر رنگ کے بڑے دلکش نمونے موجود ہیں، عالم برزخ میں مرزا غالب کا مطب، ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ، جشن آزادی کی دو پہرا اور بورڈنگ ہاؤس خصوصیت کے ساتھ زیادہ دلچسپ ہیں،

صاحبزادیاں۔ از جناب مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ بلا جلد ۱۲ار، پتہ: ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین دہلی

اردو میں سیرت و سوانح نبوی پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کی مدد سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر آسانی سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہیں، یہ رسالہ بھی اسی قسم کا ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات بلکہ اولاد امجاد کے حالات ہیں، حضرت زینبؓ، رقیہؓ اور ام کلثومؓ کے حالات مختصر اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے کسی قدر تفصیلی ہیں اور انکی زندگی کے سبق آموز اخلاقی واقعات بھی تحریر کیے گئے ہیں، حضرت ابراہیمؓ کا بھی مختصر ذکر ہے، کتاب کے آخر میں چند نظمیں، عورتوں کے پڑھنے کی بعض دعائیں، مفید نصائح اور متفرق کام کی باتیں لکھ دی ہیں، کتاب مسلمان بچیوں کے پڑھنے کے لائق ہے،

قصص ابن السبیل۔ تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۲ صفحات، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، مکتبہ بریدین الہ آباد نمبر ۳

اس کتاب کے گمنام مصنف پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جنگی ملازمت کے سلسلہ میں عراق میں متعین تھے، مگر افشائے راز کے خیال سے انھوں نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے، عراق و کردستان کی سرزمین حسن و عشق کی رنگینیوں کیلئے مشہور ہے، قصص ابن السبیل میں اسی قسم کی بعض رنگین داستانوں کو جن میں وہ خود بھی مبتلا ہوئے تھے، اور وہاں کے دوسرے دلچسپ واقعات کو افسانے کی شکل میں لکھا ہے، افسانے دلچسپ ہیں۔

"م"